محمد طفیل

محترم

(ایک سفرنامہ، ایک تذکرہ)

اِس کتاب کی تزئین اور اس کے اسکیچ، ملک کے ہونہار آرٹسٹ مسٹر اسلم کمال کے فن کے مظہر ہیں۔

اِس کتاب کا مضمون مسلسل ہے۔ اسکیچ والے صفحات "فالتو" ہیں۔ میرے اور آرٹسٹ کے امتحان کے لیے۔

جن دوستوں کے اسکیچ ہیں۔ اُن کا ذکر بھی کہیں آس پاس ہو گا!

محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اُردو ○ لاہور

HaSnain Sialvi

بارِ اوّل جنوری ۱۹۶۸ء
تعداد ایک ہزار
قیمت چار روپے
طابع نقوش پریس لاہور - محمد طفیل

پبلشر

ادارۂ فروغِ اردو، لاہور
ایبک روڈ - انارکلی

زرتشت نے کہا ——

آج کی باتیں کل کی امانت ہیں،
ان سب کو اکٹھا کر لو ۔

مصنّف

طلوع

میں لکھتا بہت کچھ ہوں۔ چھپواتا سب کچھ نہیں۔ اس لیے کہ جو لکھا، وہ بعد میں پسند نہ آیا۔ یوں میں بھی محفوظ رہا اور آپ بھی۔

احباب جو اس سفر میں "ملوّث" تھے۔ کہتے ہیں کہ اگر یہ اوراق اب نہ چھپے تو پھر کبھی نہ چھپیں گے۔ ممکن ہے انھیں اِتقا ہوا ہو۔

اسی خوف سے رِجھیر رِجھیر یادداشتوں کو ڈھونڈھا۔ گرد دور دھانی کی تاکہ دوستوں کی بات رہ جائے۔ خواہ میرے لیے بات بڑھ جائے۔

یہ سفر جو آپ کو پڑھنا پڑے گا۔ تفریحی موڈ میں لکھا تھا۔ محض یادداشتوں کے لیے، میں بستار نہیں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ زیبِ داستاں کے لیے کچھ نہیں کہتا۔

اس کتاب میں اور کچھ ملے نہ ملے، یہ ضرور ملے گا کہ آپ بھی میری طرح اُن ادیبوں کو دیکھ سکیں گے، باتیں کر سکیں گے جو "میرے تھے" میرے رُو برُو تھے۔ رہا سوال سلیقے کا، وہ اپنے بس میں اس لیے نہیں کہ فرصت کے ہاتھوں فقیر ہوں۔

محمد طفیل
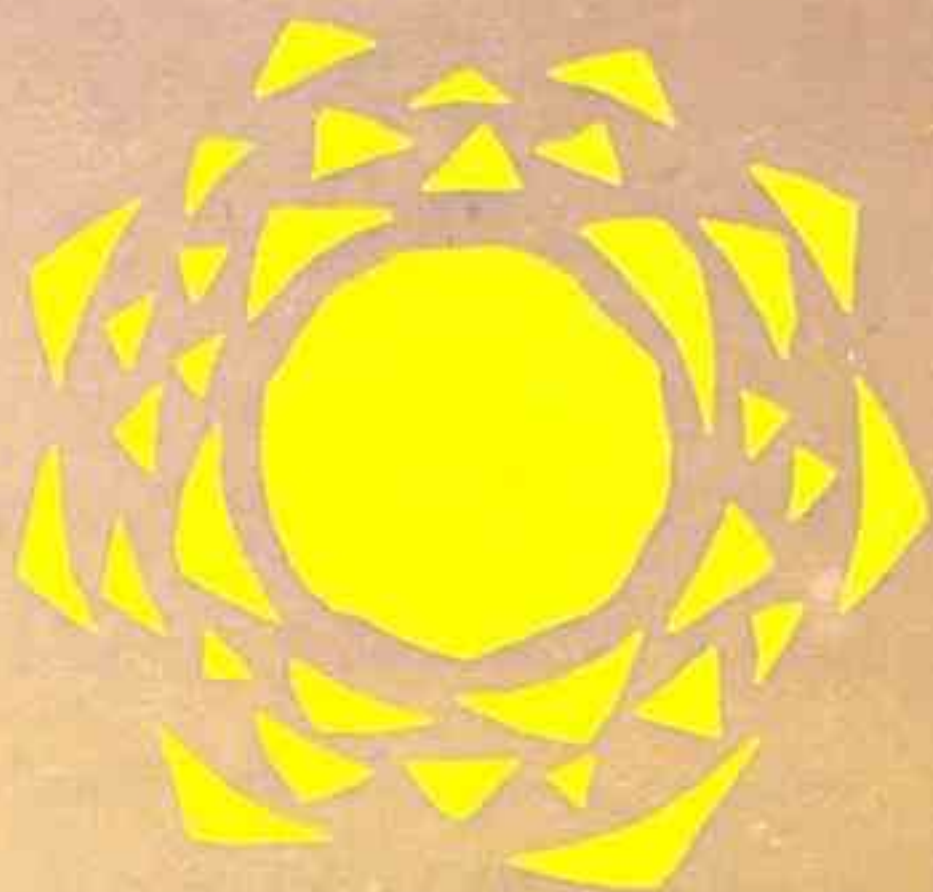
ماں کی آغوش سے نکل کر، جب انسان پہلا قدم اُٹھاتا
ہے تو اُس کی زندگی کے سفر کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یوں
انسان قدم قدم چل کر دُور نکل جاتا ہے۔ بہت دُور!
بہت ہی دُور!

"چھ، سات، آٹھ[ا] تاریخ کو شاہ عبداللطیف بھٹائی کا عُرس ہے۔
اگر فرصت ہو تو اُس میں چلے جائیں۔"

یہ ٹیلیفون رائٹرز گلڈ کے جنرل سیکرٹری کا تھا۔

میں نے تھوڑے سے توقف کے بعد کہا۔ "چلا جاؤں گا۔"

"تکلف اِس لیے نہیں کیا تھا کہ میں کئی مہینوں سے سوچ رہا تھا کہ مجھے کچھ دنوں کے لیے "شہر بدر" ہو جانا چاہیے۔ تاکہ تھوڑا سا آرام ملے۔ تھوڑی سی ذہنی فرصت نصیب ہو۔ مگر اس کا موقع نہیں ملتا تھا۔ بے شمار کام اپنا دامن پھیلا پھیلا کر مجھے رُک جانے پر آمادہ کر لیتے تھے۔ یہ بہانہ ملا تو پھر عذر ہی کیا ہو سکتا تھا۔ خرچ گلڈ کا، شرکت عرس میں، عقبیٰ بھی سنور رہی تھی۔

راولپنڈی سے ایوب محسن نے لکھا۔ میں بھی شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس میں جاؤں گا۔ ملتان سے ریاض انور جائیں گے۔ لہٰذا اپنا پروگرام بتائیں

میں نے انھیں اپنے پروگرام سے مطلع کر دیا۔ اِدھر گلڈ کے پاس،

[ا] جولائی ۱۹۶۳ء

مرکز سے "خرچہ" نہیں پہنچا تھا۔ آفس سیکرٹری نے کہا۔" اپنے خرچ پر چلے جائیے۔ واپسی پر "سفریہ" پیش کر دیا جائے گا۔"

یک نہ شد دو شد' ایک تو چکرا دینے والی گرمی میں حیدر آباد کا سفر، وہ بھی "نقد"! دوہرے مزے!

یہی بات ایوب محسن کو لکھ دی ۔۔۔ "اکیلے نہ آئیے گا۔ مبلغات ساتھ لائیے گا۔"

جواب ملا۔" میں تو عرس میں شرکت آپ کی رفاقت کی وجہ سے کرونگا ورنہ اتنی گرمی میں کیا لطف؟ ۔۔۔ رقم ساتھ لاؤں گا ۔۔۔ عشق میں یوں بھی ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ!"

میں نے سوچا، عشق میں یوں ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو۔ گلڈ میں تو بہت کچھ ہوتا ہے۔ میرا وہم ہے کہ گلڈ ایک ایسا ادارہ ہے، جو صرف چند دوستوں کو نوازنے اور باقی سب کو ٹرخانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اصول کوئی نہیں۔ للّٰہی دوستی، للّٰہی دشمنی!

معاف کیجیے۔ میں بہک چلا تھا۔ اس لیے کہ میں آپ سے ایسی باتیں نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں گلڈ کی مجلس عاملہ کا رکن ہوں۔ قواعد کی رُو سے زباں بندی ہے۔ تعمیری تنقید بھی کھلے بندوں جُرم ہے۔

ذرا رُکیے! میں ابھی آپ کو سفری حادثوں سے روشناس کراؤں گا۔

مگر پہلے مجھے جل تو جلال تو کا ورد تو کر لینے دیجیے۔ صاحب! ہمارے ہاں بھی ایک سے ایک غصیلا پڑا ہے۔

ہاں تو، میرے اور ایوب محسن کے درمیان طے یہ ہوا تھا کہ وہ مجھے لاہور کے ڈٹینگ روم میں مل جائیں گے۔ جب میں وقتِ مقررہ پر پہنچا تو وہاں بجائے ایوب محسن کے جوش ملیح آبادی کو بیٹھے پایا۔

سلام دعا ہوئی۔ گلے ولے ملے۔ پسینہ بھی معانقے میں شامل ہوا میں نے پوچھا۔ "جناب ہندوستان سے کب تشریف لائے ہیں؟"

"ابھی حاضر ہوا ہوں۔"

"وہاں کیا تھا۔ جو آپ نے لوٹنے کا نام نہ لیا۔"

"ارے میاں! وہاں کیا نہیں ہے۔ میرا بچپن، میری جوانی، سب کچھ وہاں ہے۔ یہاں میرا بڑھاپا ہے اور میں ہوں۔"

ایک دم، ذہن جوش صاحب کی رباعی سے جا ٹکرایا۔

دنیا کا عجب دور نظر آتا ہے　　　بدلا ہوا ہر طور نظر آتا ہے
حیرت ہے کہ جب آئینہ میں دیکھتا ہوں　　　بوڑھا سا کوئی اور نظر آتا ہے

میں نے بات کا رُخ بدلنا چاہا ــــ "وہاں کے احباب کا کیا حال ہے؟"

"سب ٹھیک ہیں مگر ایک صاحبہ نے آپ کو بڑا معنی خیز قسم کا سلام بھیجا ہے۔"

جوشؔ ملیح آبادی :

جاگیردارانہ نظام کی پیداوار، مگر خود اس نظام کے جانی دشمن ،

بھاری بھرکم شخصیت ، بھاری بھرکم کلام

ہلکا پھلکا مزاح ، ہلکا پھلکا مذاق

نہ اچھے دوست ، نہ اچھے دشمن

شاعر اور صرف شاعر ، آدمی اور صرف آدمی،

اس کے باوجود

قابلِ احترام ـــــ قابلِ تعظیم

ایک موہنی شخصیت

میں نے اس بات کو لطیفہ سمجھا۔ جبھی کہا۔ "حضرت سلام میں معنی خیزی نہ ہوگی۔ طنز ہوگا۔"

"طنز ہوتا تو شکایت کا کیا موقع تھا۔ ان کے سلام میں پیار تھا۔"

پتہ نہیں یہ کس کی بلا، کس کے سر تھوپ رہے تھے۔ اس لیے میں بھی مسکرا کے رہ گیا۔

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ میں نے شکایت کی کہ آپ نے اپنے آنے کی اطلاع مجھے نہ دی۔ آج تو میں حیدرآباد جانے کے لیے اِدھر آنکلا۔ ورنہ ملاقات بھی نہ ہوتی۔ کیا بالا ہی بالا نکل جانے کا پروگرام تھا؟

"ہاں صورت تو ایسی ہے۔ اُمّ الشعرا[1] بھی ساتھ ہیں۔ مگر میں نے تو میر صاحب کو لکھا تھا کہ طفیل کو اطلاع دے دینا۔"

اس پر میں نے کہا۔ "میر صاحب نے تو کوئی اطلاع نہ دی۔ ممکن ہے ان کے ذہن میں اب کے آپ کا کوئی ناجائز استعمال ہو۔ ورنہ کیوں چھپاتے؟"

"سچ کہا۔ نیتوں کا حال اللہ جانے!"

"بہت ہی اچھا ہوا کہ آپ سے ملاقات ہوگئی۔ ورنہ شیعہ سُنّی فساد ہو جاتا۔"

میر صاحب شیعہ ہیں۔ اس لیے جوش صاحب خوب ہنسے۔ پھر کہنے لگے "دیکھئے ابھی ابھی تو شیعہ سُنّی فساد ہوئے ہیں۔ اب اور نہ کیجیے گا۔ صاحب!

---

[1] جوش صاحب اپنی بیوی کو اُمّ الشعرا کہتے ہیں۔

میں ہندوستان میں تھا۔ جب یہ فسادات ہوئے۔ وہاں لوگ فسادات کا ذکر کرتے تھے اور میں کٹ کٹ جاتا تھا۔ ہم بھی کن جُہلا میں پیدا ہوئے۔ اور ہاں سنا ہے کہ مبین الحق صدیقی سپیکری سے گئے؟"

"جی ہاں گئے۔"

"بھئی ان پر کیا چارج تھے؟ آدمی تو معقول ہے۔"

"جی ہاں آدمی تو معقول ہیں۔ جہاں اُن پر اور چارج ہیں، وہاں ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے اسمبلی ہال میں مشاعرہ کرا ڈالا تھا۔"

جوش صاحب نے اپنے سر کو معنی خیز انداز میں ہلا کر کہا۔" اچھا! اچھا! تو گویا شعر پڑھنا بھی جرائم میں داخل ہو گیا۔"

"اب تو یہی سمجھنا چاہیے۔"

"میاں وہ دن آنے والا ہے۔ جب شاعروں کو اس پاداش میں جوتے مارے جائیں گے کہ سالا شعر کہتا ہے۔"

ابھی اتنی ہی باتیں ہوئی تھیں کہ وہ گاڑی آ گئی، جس میں مجھے سوار ہونا تھا۔ جوش صاحب سے یہ کہہ کر اجازت لی کہ اب ملاقات کراچی ہوگی۔

"ہاں صاحب! ضرور ہوگی۔ اپنے نزولِ اجلال سے مطلع فرمائیے گا۔"

گاڑی چلنے کے تھوڑی دیر پہلے ایوب محسن صاحب بھی آ گئے۔ وہ موجود تو مجھ سے بھی پہلے تھے مگر کھانے دانے کے چکر میں مقررہ جگہ پر موجود نہ تھے۔

اس لیے میں متردد تھا۔ اللہ کا شکر کہ "برآمد" ہو گئے۔

۲
قدم
۱

ہمیں جس ڈبہ میں جگہ ملی۔ اُس میں ہمارے علاوہ ایک اینگلو انڈین فیملی تھی۔ دو بڈھے میاں بیوی اور دو ان کی بچیاں، ایک کی عمر دس بارہ برس، دوسری چودہ پندرہ کے سن میں، اس عمر کی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں اور اس عمر کے میاں بیوی بھی، مگر ان زن و شوہر میں بھی ایک بات تھی اور ان لڑکیوں میں بھی، میاں اتنے شریف کہ سوائے مسکرانے کے کوئی کام نہ تھا۔ وہ اپنی مسکراہٹوں سے اور اپنے چہرے مُہرے سے، حد درجہ شریف بلکہ مسکین نظر آتے تھے۔ بیوی (بلکہ وائف) بڑی رکھ رکھاؤ والی، بے حد خدمت گزار خاتون، موصوفہ کی ہر لمحہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنے شوہر کے لیے کچھ نہ کچھ کرے۔ بچھ بچھ جائے۔ وہ شوہر کے سلسلے میں اپنی موجودگی کا احساس دلانے پر تُلی ہوئی تھیں اور چاہتی تھیں کہ دل و جان پیش کرتی رہیں۔

بچیاں بے حد چنچل، بے حد شوخ، میاں بیوی کی ضد، ان کا ایک منٹ نچلا بیٹھنا محال، چلتی گاڑی میں وہ اچھلتی کودتی رہیں، جیسے اسپرنگ

لگے ہوں۔ کبھی اِدھر اچھلیں، کبھی اُدھر، اور کچھ نہ ہوتا تو کھڑکی میں سے منہ باہر کرکے، گزرتی ہوئی چیزوں، مکانوں اور لوگوں پر تبصرہ کریں اور زور زور سے ہنستیں، عجیب سی "متوجہ آمیز" فضا تھی۔

چھوٹی بچی تو گاڑی چلنے کے کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد سو گئی۔ مگر بڑی لڑکی نہ سوئی۔ اب ڈبے میں اُس اکیلی کا راج تھا۔ وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتی —— میں سونا چاہتا تھا۔ مگر اُس کی سیمابیت نے آنکھیں کھلی رکھنے پر مجبور سا کر دیا۔ جیسے گویائی کے بغیر کہہ رہی ہو —— آج سونے نہ دوں گی۔ وہ تو اللہ کا شکر کہ میں زبردستی سونے کی کوشش کرکے، کچھ اپنی خاندانی شرافت کا خیال کرکے، کچھ اپنے اُوپر لعنت بھیج کے سو گیا۔ اس کے بعد پتہ نہیں کیا ہوا۔ وہ ضرور بار بار بالوں کو جھٹکے دیتی ہوگی۔ اور ضرور ٹانگوں کو کبھی اپنی سیٹ پر رکھتی ہوگی اور کبھی اُسی پھرتی سے نیچے رکھ دیتی ہوگی۔ اور پھر کبھی اِس کروٹ لیٹتی ہوگی، کبھی اُس کروٹ، کبھی اوندھی، کبھی سیدھی، غرض وہ ضرور ہر منٹ کے بعد اپنا زاویہ بدلتی رہی ہوگی۔

ملتان کے اسٹیشن پر اپنے تیسرے رفیق ریاض انور کو کم نگاہی سے اس لیے ڈھونڈھا کہ نیند غلبہ پا رہی تھی آنکھوں میں خمار تھا۔

کوئی چھ بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے باہر دیکھا تو ریاض انور ذرا سی دیر کے لیے دکھے۔

ایّوب محسن :

سگار پہ سگار پینا، پھُلی ہنسی ہنسنا، انھی دو باتوں کی طرف ان کی توجہ ہے۔ ان کے علاوہ سارے کام اضافی۔

کھُلتا ہوا رنگ، صفاچٹ مکھڑا،
گول گول چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں،
داڑھی کی طرف سے فارغ، بالوں کی طرف سے فارغ
اور اگر فارغ نہیں ہیں تو
اخلاق کی طرف سے ___ محبت کی طرف سے
مروّجہ بوجھ کی طرف سے

اطمینان ہوا کہ تینوں ساتھی، جنھیں شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس میں گلڈ کی طرف سے نمائندگی کرنا ہے۔ وہ سب موجود ہیں اور "چھکا چھک چھکے" جا رہے ہیں۔

میں اٹھا، غسلخانے میں گیا۔ شیو کر کے تیار ہونے کا ارادہ کیا۔ اس لیے کہ حیدرآباد آیا ہی چاہتا تھا۔ میں نے صابن منہ پہ لگایا۔ برش سے خوب جھاگ نکالا۔ منہ جھاگوں جھاگ، مگر جب سیفٹی ریزر ڈھونڈھا تو وہ غائب۔ معلوم ہوا کہ وہ تو گھر بھول آیا ہوں۔ تھوڑی دیر مقدس صورت بنائے سوچتا رہا کہ کیا کروں، کدھر جاؤں۔ بالآخر فیصلہ کرنا پڑا کہ اپنے رفیق ایوب محسن سے سیفٹی ریزر لوں اور اس مشکل سے نجات پاؤں۔ مگر دل اس فیصلے پر راضی نہ تھا۔ اس لیے کہ یہ چیز بھی محبوب کی سی اہمیت رکھتی ہے۔ پرائی ہو تو کھلتی ہے۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ ناچار محسن صاحب سے سیفٹی ریزر مانگا۔ یوں مشکل آسان ہوئی۔

حیدرآباد کا اسٹیشن آ گیا۔ نیچے اترے۔ پبلک ریلیشنز کے ایک دو افسر موجود تھے۔ ان میں ایک تو پورا افسر تھا اور ایک آدھا، پھونک مارنے سے اڑنے والا ــــ اور چند ادیب جن میں محسن بھوپالی، اختر انصاری اکبر آبادی اور سلیم اختر۔

ابھی تھوڑی دور چلے ہوں گے کہ جمیل الزماں ملے جو پبلک ریلیشنز

کے ڈائرکٹر تھے۔ ابھی کچھ دن پہلے وہ حیدر آباد ہی میں اسی پوسٹ پر تھے۔ مگر آج کل ملتان بھیج گئے تھے۔ انھوں نے کہا۔ "طفیل صاحب آپ کو ملتان کے اسٹیشن پر بڑا ڈھونڈھا۔ مگر آپ نہ ملے۔"

"میں نے آپ کو دیکھا تھا۔ مگر اس خیال سے نہ بلایا کہ آپ کسی بڑے سرکاری افسر کی تلاش میں ہوں گے۔"

"بھئی آپ سے بھی بڑا افسر کوئی اور ہو سکتا ہے۔"

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اِس لیے کہ جمیل صاحب مجھ سے خصوصیت برتتے ہیں۔ دوسرے چٹکلے دار باتیں کرنے میں بھی ماہر۔ اس لیے میں نے اُن کے خلوص اور اُن کی خوش گفتاری میں سے، کسی ایک بات پر بھی شبہ کرنا مناسب نہ جانا۔

اس کے بعد جمیل صاحب نے پوچھا۔ "یہاں آپ کے لیے کیا انتظام کیا گیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہمیں تو کچھ معلوم نہیں۔ چنانچہ انھوں نے وہاں کے متعلقہ افسران سے پوچھا۔ پتہ چلا کہ ہم کسی ہوٹل میں اپنے خرچ سے ٹھہریں گے۔ پہلے شیزان لائے گئے۔ دریافت کرنے پر علم ہوا کہ کوئی کمرا خالی نہیں۔ یوں "نیے" منتظمین کی صلاحیتوں پر پہلے ہی مرحلے پر ایمان لانا پڑا۔ اس کے بعد اِدھر اُدھر ٹیلیفون کھٹکائے گئے۔ ایک ہوٹل* والے مان گئے۔ مان کا لفظ اس لیے

---

* ہوٹل کا نام دانستہ نہیں لکھا۔ تاکہ وہ نالش نہ کر سکیں۔

استعمال کیا ہے کہ عرس کی وجہ سے یہاں کے تمام ہوٹل بھرے پڑے ہیں۔
یہ تو متعلقہ حضرات کو چاہیے تھا کہ وہ پہلے سے کچھ طے کر رکھتے تاکہ سبحان اللہ
کہنے کی نوبت نہ آتی۔

۳
قدم

ہوٹل میں صرف ایک کمرا خالی تھا۔ اس میں دو بستر تو پہلے سے
لگے ہوئے تھے۔ تیسرے کے لیے منیجر سے کہا کہ وہ کسی طرح ایک
چارپائی اور ڈال دیں۔ وہ کچھ آمادہ ہو ہی گئے۔

تھکے ماندے تھے۔ نہانے کا ارادہ کر لیا۔ پہلے ایوب محسن نہانے
کے لیے لپکے۔ جب یہ نہا کر باہر آئے تو منہ بنائے ہوئے تھے۔ مگر تجسس
میں نے پوچھا۔ "خیریت ہے؟"

کہنے لگے۔ "ہے تو خیریت، مگر غسل خانہ بڑا واہیات ہے۔ کپڑے
وغیرہ ٹانگ رکھنے کی جگہ نہیں۔ صورت تو یہ ہے کہ ہمیں پاجامہ تک باہر
اتار کے جانا چاہیے۔"

جس ہوٹل کا یہ قصیدہ پڑھا جا رہا ہے۔ وہ حیدر آباد کے بڑے
ہوٹلوں میں سے ہے۔ اس لیے کہ اس کے چارجز بہت زیادہ ہیں۔

دکھاوے کے ٹھاٹھ باٹھ بھی ہیں۔ مگر "اندر خانے" جو بیتتی ہے۔ وہ آپ کو ضرور بتاؤں گا۔ بس ذرا سا انتظار فرمائیں۔

بہرحال ایوب محسن کے بعد میں نے سوائے پاجامے کے سارے کپڑے باہر ہی اُتار دیئے تاکہ غسل خانے سے نپٹ سکوں۔ ابھی جاکر پانی کا فوارہ کھولا ہی تھا کہ اچھے خاصے اُبلتے ہوئے پانی سے واسطہ پڑا۔ جس نے ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔ بس پانی تھوڑا سا اور گرم ہوتا تو کوئی بھی سگھڑ عورت چائے دم کر لیتی۔ جیسے تیسے پانی سے بچتے ہوئے نہایا۔ باہر آیا تو میں نے ریاض انور سے دانستہ اپنی کیفیت بیان نہ کی۔ تاکہ جو ہم پر گزری ہے۔ وہی اس پر گزرے۔ مگر اس اللہ کے بندے نے نہانے کی بجائے منہ ہاتھ دھو لینے پر اکتفا کیا۔ یوں مجھے وہ لطف لینے کا موقع نہ ملا۔ جو ایوب محسن کو میرے سلسلے میں مل چکا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر گزری ہو گی کہ حیدر آباد کے ساتھیوں میں سے کسی نے کہا۔ نیچے ہال میں کچھ لوگ منتظر ہیں۔ ہم نیچے پہنچے۔ تعارف ہوا۔ آپ ہیں ایاز شیخ، آفاق صدیقی اور ــــ اور ــــ ان میں سے ایک اور نے مجھ سے کہا۔ ہم آپ کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اس لیے کہ آج صبح پیر حسام الدین راشدی کا کراچی سے ٹرنک کال آیا تھا کہ طفیل نہ جانے کس مصیبت کی بنا پر ادھر آ نکلا ہے۔ اِس لیے اس کا خیال رکھا جائے

ریاض انور :

چھوٹا قد، اکہرا بدن، سانولا رنگ، نازک خط و خال، باتیں دلچسپ، پیشہ وکالت!

گفتار میں دلکشی نہ ہوتی تو اس بچّہ نما آدمی کی وقعت زیادہ نہ ہوتی۔ بولنا اور صرف بولنا، مسکرانا اور صرف مسکرانا، یہ دو "عارضے" اس کی زندگی کے کامیاب حربے ہیں اور رہاں صرف اپنی ہی کہے جاتے ہیں تو اس کا جواب ہی نہیں۔

ادیب کم، لیڈر زیادہ! لہٰذا واہ واہ کم، زندہ باد زیادہ!

چنانچہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے میری ڈیوٹی لگائی ہے کہ میں آپ سے ملوں اور عرض کروں کہ میں آج بے حد مصروف ہوں۔ اس لیے کہ سارا انتظام میرے ذمہ ہے۔ کل کلاں کو اطمینان سے ملاقات ہوگی۔

ایک بجے کے قریب معلوم ہوا کہ کراچی سے بھی ادیب آئے ہیں اور وہ سب نیچے کھانے کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ نیچے پہنچے تو دیکھا کہ آدم جی پرائز والے شوکت صدیقی، افکار کے مدیر صہبا لکھنوی، حریت کے فوٹو گرافر داؤد احمد اور عارف انور بیٹھے ہیں اور ہاں مشرقی پاکستان کے پروفیسر بذل الرشید بھی موجود ہیں۔

کچھ گلے ملے۔ کچھ سے ہاتھ ملائے۔ یوں مقامی اور باہر سے آئے ہوئے ادیبوں کا اچھا خاصا مجمع ہو گیا ہے۔ کھانا آیا۔ سبھی نے کھایا۔ بل اچھا خاصا بنا۔ اب بیرا پوچھتا ہے۔ بل نقد ادا کریں گے یا حساب میں لکھا جائے گا؟" حساب میں لکھا جائے تو کس کے حساب میں، نقد ادا کرے تو کون کرے۔ ہم جو لاہور اور پنڈی سے چلے تھے۔ سب کنفرم دے تھے اس لیے منہ اٹھائے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اس "باجماعت کھانے" کا بل کون ادا کرے کہ اتنے میں شوکت صدیقی نے کہا۔ بل ہمارے نام لکھ دیا جائے۔ (اور لفظ ہمارے پر زور دیا) یہ طنطنہ اس لیے تھا کہ سفر خرچ لے کے چلے تھے۔ کچھ بھی ہو۔ مگر اس وقت

بجُھ بیٹھتے سب خوش ہوئے۔

کھانے کے کمرے سے نکل کر، سب کے سب ہمارے کمرے میں آگئے۔ ایران توران کی باتیں شروع ہوگئیں۔ شوکت صدیقی نے پوچھا "وہ پنجابی کا کیا جھگڑا تھا۔ شہاب صاحب کے فیصلے کو کس نظر سے دیکھا گیا"۔

ریاض انور چونکہ وکیل ہیں۔ اس لیے ہر جھگڑے میں بولنا، ان کا پیشہ، ورانہ حق ہے، اس لیے پہل کرتے ہیں —— "وہ جو شفقت تنویر میرزا ہیں۔ بڑے جھگڑالو ہیں۔ انھوں نے ہی چھوٹی سی بات کو بڑھا دیا تھا"۔

پھر شوکت صدیقی نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ جیسے میری رائے بھی جاننا چاہتے ہوں۔ اُن کا ایما پا کر میں نے کہا۔ شہاب صاحب کے فیصلے کو زیادہ تر پسند نہیں کیا گیا۔ بڑا سخت فیصلہ تھا وہ۔ ہم اس فیصلے کی اُمید نہیں رکھتے تھے۔ مگر چُپ اس لیے رہے کہ شہاب صاحب نے فیصلہ سنانے سے پہلے کچھ اس دلدوز انداز میں بعض واقعات ایسے بتائے۔ جن سے ہم سب پریشان ہوگئے تھے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ بعض افسران یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ گلڈ لڑنے جھگڑنے والوں کا ادارہ بنتا جا رہا ہے۔ یہ تاثر ہم میں سے کسی کو بھی پسند نہ تھا۔ ایسے حالات

شوکت صدیقی :

اپنی آواز خود ہی سننے والے، اپنا لکھا بھی خود زیادہ سمجھنے والے' افسانوی پلاٹوں میں شریک ہو مگر خود اپنی زندگی میں بھولے بھالے، نہ اپنی اچھائی میں نہ دوسروں کی برائی میں،
کبھی کم آمیز: کبھی محفل آرا، کبھی کم سخن: کبھی بسیار گو، غرض دھوپ چھاؤں قسم کے آدمی!

ہیں، کسی نے بھی شہاب صاحب کے فیصلے پر چوں نہ کی۔
ہوتے ہواتے باتیں، مشرقی پاکستان کے سفر کے بارے میں نکلیں جو صدر پاکستان کے ساتھ کچھ ادیبوں نے بھی کیا تھا۔
شوکت صدیقی نے کہا۔ اجمل اور جمیل جالبی تو خواتین کے لیے قلی کا کام دیتے تھے۔ اُن کی یہ بڑی بڑی چیزیں اُٹھائے پھرتے تھے۔ شریکِ سفر تھیں۔ قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور جمیلہ ہاشمی۔
ایک رات کیا ہوا کہ ایک افسانہ نگار خاتون بسکنے لگیں۔ وجہ دریافت کی گئی تو پتہ چلا کہ وہ چاہتی ہیں کہ مجھے اس وقت ٹیلیفون پر بیٹی کی آواز سنوائی جائے۔ گہری رات کا وقت، اور ان کا یہ مطالبہ۔ سب پریشان ہوئے مگر صاحب انتظام کیا گیا۔ ماں نے بیٹی سے ملاقات کی تو وہ مطمئن ہوئیں۔ ورنہ ماممتا کے ہاتھوں بُری طرح پریشان تھیں۔
اسی طرح ہم کسی دور دراز مقام پر گئے ہوئے تھے۔ سیر کر کے واپس لوٹے۔ کوئی دس ایک میل واپس آ گئے ہوں گے کہ ایک محترمہ نے کہا۔ " اوہو! میری تو وہاں عینک رہ گئی۔ موٹر واپس لے جائی گئی۔ ابھی موٹر کوئی پانچ میل واپس گئی ہو گی کہ محترمہ نے کہا۔ عینک مل گئی۔ مل گئی۔ عینک ان کی گود میں پڑی ہوئی تھی ــــــ اور موٹر اپنے مقام سے بھی پانچ میل پیچھے چلی گئی تھی۔

۴
قدم

شام کے پانچ بجے، پروگرام کے مطابق، ہمیں پریس کلب پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ وہاں سے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ نے ہمیں بھٹ شاہ لے جانا تھا۔ چنانچہ ہم سب بے قاعدہ قسم کے لوگ بھی وقتِ مقررہ پر پہنچے۔

پریس کلب پہنچے تو وہاں کوئی صحافی تاش کھیل رہا تھا۔ کوئی گپ بازی میں مصروف تھا۔ کوئی صرف قہقہے ہی لگا رہا تھا۔

ہم جب اس ماحول میں فٹ نظر نہ آئے تو باہر نکلے۔ گھاس پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پتہ چلا کہ سب کے چیونٹیاں چڑھ گئی ہیں۔۔۔ اب ہم کپڑے جھاڑ رہے ہیں۔ ایک دو چیونٹیاں ہوتیں تو ہم اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتے۔ وہاں تو معاملہ لاتعداد والا تھا۔ اس لیے ہم اپنے جسم کے بعض حصّوں کی خیر مانگ کے بے نیاز ہو گئے۔

کوئی چھ بجے کے قریب بس چلی۔ ابھی چند قدم ہی چلی ہو گی تو رکو رکو کی آواز آئی ـــــ فلاں صاحب پیچھے رہ گئے۔ فلاں صاحب ابھی آئے نہیں۔ ایک سے ایک اخبار نویس چیخ رہا تھا۔ بس، چند

منٹ رکنے کے بعد دوبارہ جو چلی تو پھر روکو روکو، معلوم ہوا پریس فوٹوگرافر فلمیں خریدیں گے۔ ابھی روکو اور چلو کے چکر سے نکلے ہی تھے اور بس بھی زنّاٹے کے ساتھ چلنے لگی تھی۔ خیال پیدا ہوا ہی تھا کہ اب بس منزلِ مقصود پر پہنچ کے ہی دم لے گی کہ بس پھر رکوائی گئی۔ معلوم ہوا کہ ایک اخبار نویس کا گھر یہیں کہیں ہے۔ اس لیے وہ اُتریں گے۔ یہاں تک تو محض شغلاً چلے آئے تھے۔ غور کیجیے کہ اس روکو اور چلو کے ماحول میں ہم بھٹ شاہ جا رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اخبار نویس بھی عجیب چیز ہوتے ہیں۔ ممکن ہے اخبار نویس بھی ہمارے بارے میں سوچتے ہوں کہ یہ ادیب بھی عجیب قسم کے بے حس ہوتے ہیں کہ کسی زیادتی پر احتجاج ہی نہیں کرتے۔

بس بھٹ شاہ کی طرف جا رہی ہے اور میرا دماغ پوری بے ربطی کے ساتھ، تاریخ کے اِکّا دکّا واقعات کی طرف پلٹتا ہے اور کبھی شاہ صاحب کی طرف لوٹتا ہے۔

سرزمینِ سندھ پر، سب سے پہلے محمد بن قاسم نے اسلامی جھنڈا لہرایا۔ شاہ عبداللطیف بِھٹائی اورنگ زیب کے عہد میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد سے کوئی ۳۲ میل دُور ان کا مزار ہے۔

شاہ صوفی تھے۔ شاعر تھے۔ ان کا کلام یہاں کے بچّے بچّے کی زبان پر ہے۔ کلام میں عورت کا کردار خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ

انھوں نے عورت کو عاشق اور مرد کو معشوق قرار دیا ہے۔ شاہ نے اپنے کلام میں جنسی لذت کے لیے عورت کا ذکر نہیں کیا۔ بلکہ ان کے ہاں عورت عاشق حقیقی کا مثالی کردار ہے وغیرہ وغیرہ!

میں سوچنے لگا کہ شاہ صاحب کے کلام میں بلا وجہ معرفت ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ہم ان کے کلام کو سیدھے سادے انداز میں محض شاعری ہی کہیں تو بھی ان کا درجہ بلند نظر آتا ہے۔ چلیے یہی سہی کہ ان کی شاعری عاشق حقیقی کے گرد گھومتی ہے ــــ میں نے ہتھیار یوں ڈالے کہ میں بھی اُسی قوم کا ایک فرد ہوں جو انسانوں کو ولی اللہ بنا دیتی ہے۔

میں اپنے اُوٹ پٹانگ خیالات سے اُس وقت چونکا۔ جب ایک سپاہی ہمیں اور آگے جانے نہیں دے رہا تھا۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ ”ہم لوگ سرکاری آدمی ہیں۔ ہمیں جانے دیا جائے۔“

سرکاری آدمی بھی آدمی ہوتے ہیں۔ مگر مجھے اس وقت سرکاری آدمی کا لفظ سن کر بڑا افسوس ہوا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ہمیں اس ”لفظی اعزاز“ کا اہل جانے۔ چہ جائیکہ ہم میں سے کسی نے خود ہی یہ کہہ دیا ہو۔ بہرحال سپاہی ٹوکتے رہے۔ روکتے رہے اور بس میں سے لوگ کہتے رہے کہ ہم پریس کے لوگ ہیں۔ سرکاری آدمی ہیں۔

بہرحال اب ہم حیدر آباد سے ۳۲ میل دور شاہ صاحب کے قدموں

میں ہیں اور میرے سامنے شاہ عبداللطیف کا مزار ہے۔ مزار ایک ٹیلے پر ہے۔ سندھی زبان میں بھٹ ٹیلے کو کہتے ہیں۔ مزار کے سامنے ایک جھیل ہے جھیل سے ذرا فاصلے پر ایک آڈیٹوریم بنایا گیا ہے۔ جو بڑی حد تک شاہ کے مزار کا چربہ ہے۔ غرض خوب روپیہ خرچ کرکے جنگل میں منگل کا سماں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ والوں نے کہا۔ عرس کا افتتاح ½ ۷ بجے ہوگا۔ اس لیے ہمیں ۷ بجے پہنچ جانا چاہیے۔ درمیانی وقفے میں وہاں کے دو ایک چکر لگائے۔ عقیدتمندوں کو دیکھا۔ بازار جو وقتی طور پر بنے تھے ان میں گھومے، خالص دیہاتی قسم کا ماحول تھا۔ لوگ بھی زیادہ تر دیہاتی تھے سات بجے کے قریب آڈیٹوریم میں پہنچے۔ بڑے سخت قسم کے انتظامات تھے۔

پہلے کراچی سے آنے والے دوستوں میں شاہد احمد دہلوی، ابن انشا، اور مشفق خواجہ کے نام تھے۔ مگر جو پہنچے تھے۔ اُن میں شوکت صدیقی، صہبا لکھنوی اور عارف انور تھے۔ اس لیے داخلہ کے جو پاس بنے ہوئے تھے۔ وہ پہلے آنے والے حضرات ہی کے تھے۔ چنانچہ آڈیٹوریم کے دروازے پر ہمیں روک دیا گیا۔

شوکت صدیقی بیخ پا ہیں۔ "ہم لوگ سب کے سب واپس چلے جائیں گے"

اتنے میں کسی نے ابوالنصر کمشنر حیدرآباد ڈویژن کو اطلاع دی۔ تب کہیں جا کر ہم آڈیٹوریم میں داخل ہو سکے۔ ورنہ اس کا امکان تھا کہ قافلے کا قافلہ منزل پہ پہنچ کے واپس چلا آتا۔

آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ اس جنگل میں اتنے لوگوں کا ہجوم ایک معنی رکھتا ہے۔ مگر عقیدت مند ہیں کہ صبح سے بیٹھے ہیں اور رات بھر بیٹھیں گے اور یوں تین چار دن، جو یہ عرس منایا جائے گا، اپنے شب و روز یونہی گزاریں گے۔

۵
قدم

پونے آٹھ بجے کے قریب صدرِ پاکستان آئے۔ ان کے ہمراہ گورنر مغربی پاکستان تھے۔ پیچھے ذوالفقار علی بھٹو، ڈُر محمد اوستو اور عبدالقادر سنجرانی[1] تھے۔

اب ایک صاحب مائیک پر آئے۔ انھوں نے اعلان کیا۔ اب فلاں صاحب تلاوتِ قرآن کریم کریں گے۔ میں نے اپنے ساتھی جمیل الزماں سے پوچھا۔ "یہ کون صاحب ہیں جو اعلان کر رہے ہیں؟"

انھوں نے بتایا "یہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ہیں۔ یہی اس تقریب کے آرگنائزر ہیں اور آج کل سندھ یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر ہیں۔

---

[1] ان دنوں ڈُر محمد اوستو اور عبدالقادر سنجرانی وزیر (مغربی پاکستان) ہوا کرتے تھے۔

یہ وہی بلوچ صاحب تھے، جنھیں راشدی صاحب نے ٹیلیفون پر کہا تھا کہ طفیل کا خیال رکھا جائے۔ وہ خود اتنے مصروف تھے کہ ضرورت تھی کہ کوئی ان کا خیال رکھتا۔

ڈاکٹر بلوچ پہلے سندھی میں اعلان کرتے۔ ترجمہ انگریزی میں کرتے۔ حالانکہ چاہیے یہ تھا کہ وہ اعلان سندھی میں کرتے۔ ترجمہ اُردو میں کرتے۔ مگر یوں نہ کیا گیا۔ جو کھٹکنے والی بات تھی۔

میں نے یہاں سارے ہی پڑھے لکھے سندھیوں میں یہ بات دیکھی۔ کہ اگر آپ بات اُردو میں کریں گے تو وہ آپ کو انگریزی میں جواب دیں گے۔ یہ اگر اُردو سے تعصب کی بات نہیں تو اس سے ملتی جلتی کوئی بات ضرور ہے۔ میں نے حیدر آباد کی دیواروں پہ یہ لکھا بھی دیکھا ——"ون یونٹ توڑ دو"—— "اُردو ہماری زبان نہیں"۔

خطبہ استقبالیہ کے بعد، کچھ اور چھوٹے موٹے اعلان ہوئے۔ دو ایک بار صدر نے گورنر کے کان میں کوئی بات کہی۔ مگر گورنر نے صدر کے کان میں کوئی بات نہ کہی۔ اس کے بعد ایک دم صدر پاکستان، بغیر کسی اعلان کے مائیکروفون کے سامنے پہنچ گئے۔

انھوں نے چند باتیں بڑی روانی کے ساتھ کہہ دیں اور اس کے بعد واپس آکر بیٹھ گئے۔ انھوں نے اس تکلف کی ضرورت نہ سمجھی کہ کوئی ان کے

بارے میں، پہلے پچھلے دار قسم کے کلمات کہے اور پھر مائیکروفون پر آئیں۔ مجھے صدر کی یہ ادا بھائی۔ نمائش سے انسان، جس حد تک بچ سکے اچھا ہی ہے۔

صدر پاکستان کی تقریر کے بعد محفل موسیقی آراستہ ہوئی۔ سبھی سنبھل کے بیٹھ گئے۔ کانوں سے زیادہ نگاہوں سے کام لیا جانے لگا۔

سب سے پہلے زرینہ بلوچ آئیں۔ جنھوں نے شاہ صاحب کا کلام بڑے دلکش انداز میں سنایا۔ جسے سب نے پوری توجہ اور سکون سے سُنا۔ حتیٰ کہ بھٹو صاحب نے بھی غور سے سنا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ اعلانات اور تقریروں کے دوران برابر سنجرانی صاحب سے باتیں کرتے رہے تھے۔ جیسے تقریریں اور اعلانات روزمرّہ کی باتیں ہوں۔ جن پر دھیان نہ بھی دیا جائے تو کچھ زیاں نہ ہو۔ مگر موسیقی اور گانے سے بے توجہی خسارے کا سودا ہو۔

اس کے بعد مصری خاں جمالی نے سازوں کی مدد سے شاہ صاحب کا کلام لہرایا۔ جو بے حد پسند کیا گیا۔ ایک صاحب جمالی کے ساتھ گھڑا بجا رہے تھے۔ وہ سب کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ ایک تو وہ گھڑا بہت اچھا بجاتے تھے۔ دوسرے اس کے ساتھ ایکٹنگ بھی کرتے تھے۔ جو مزا دیتی رہی۔ جب یہ پروگرام تالیوں کی گونج میں ختم ہوا تو روبینہ بیگم کا نام پکارا گیا۔

روبینہ بیگم کا نام آج دوپہر میں نے اپنے رفیق ریاض انور سے سنا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے روبینہ کی آواز میں بڑا سوز ہے۔ معلوم ہوتا ہے، چوٹ
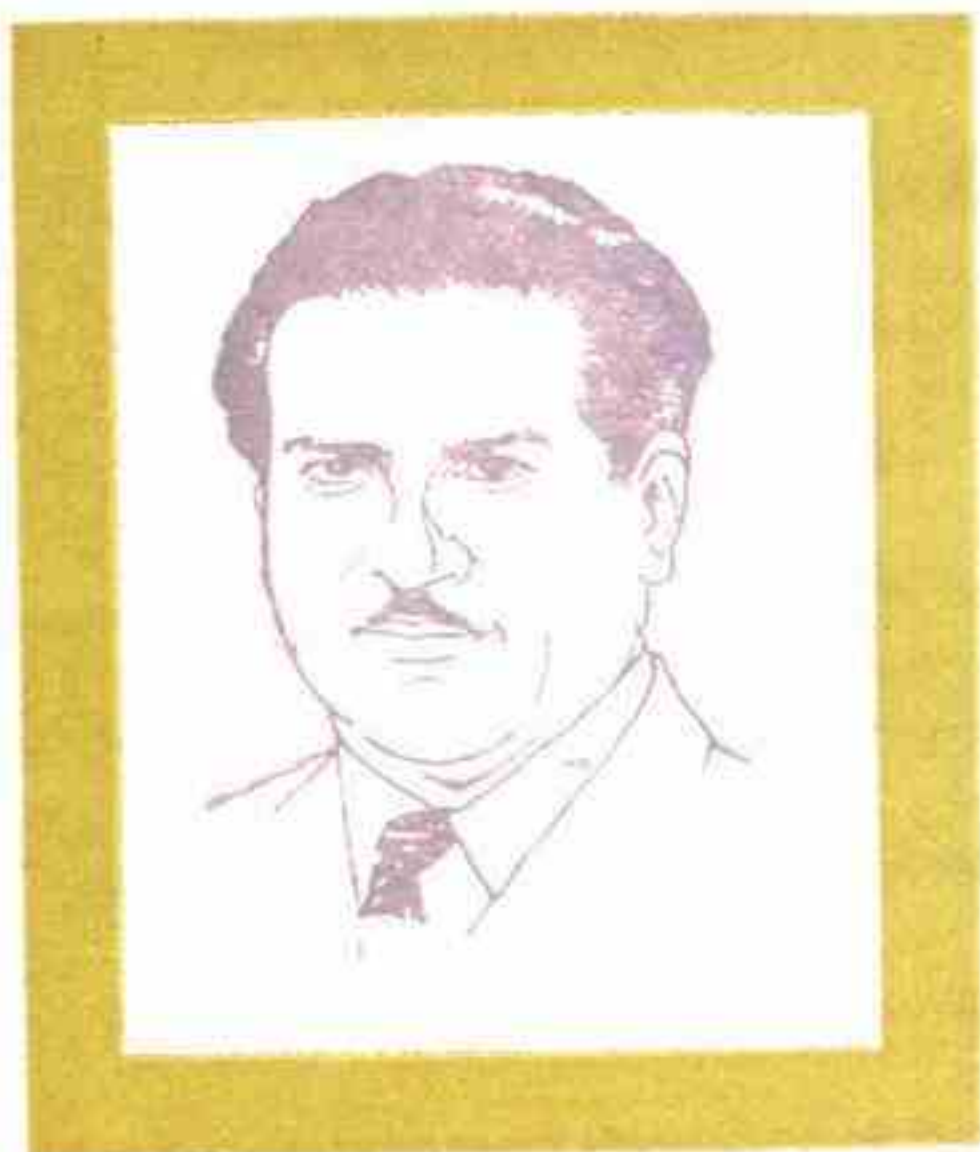
ڈاکٹر نبی بخش بلوچ :

بڑی سادہ طبیعت کے مالک۔ اتنے پڑھے لکھے ہونے کے باوجود خالص سندھی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی وضع قطع اور اپنا ماحول دانستہ نہیں بدلا۔ ورنہ انھیں بھی لاٹ صاحب بنتے کیا دیر لگتی۔

بڑے متحمّل، بڑے بُردبار، بڑے استغنا پسند، مگر جب معاملہ سندھی زبان کا آجائے یا سندھ کے کسی مسئلے کا تو نہ یہ بُردبار، نہ متحمل مزاج، نہ استغنا پسند، پھر تو یہ قدرے خطرناک آدمی بن جاتے ہیں۔

یہ مسکراتے بھی بہت ہیں۔ مگر ہر جگہ ان کے مسکرانے کے معنی مختلف ہوتے ہیں۔

کھائے ہوئے ہے۔ بڑی خوبصورت ہے۔ بڑی پڑھی لکھی ہے۔ بہرحال ریاض
روبینہ کا ذکر اس انداز سے کرتے تھے کہ انھیں نگاہوں میں تولنا پڑا۔

جب روبینہ کا نام پکارا گیا تو میں نے ریاض انور کا ہاتھ دبایا۔ پھر کیا
تھا۔ ریکارڈ لگ گیا۔ دیکھنا ابھی جگ مگ ہو جائے گی۔ آواز سنو گے تو معلوم
ہوگا۔ جیسے کوئی آسمان سے اپسرا اُتر آئی ہو۔

اتنی دیر میں روبینہ ڈائس پر آگئیں۔ میں نے اُسے دیکھ کر کہا۔
"یار جھلا جھل تو نہ ہوئی۔ واجبی سی صورت ہے۔ آپ نے بلا وجہ صبح سے کان
کھا رکھے تھے۔"

ریاض ہار ماننے والا ہے ہی نہیں۔ اس نے کہا۔ ابھی دیکھنا، آواز کے
ذریعہ جگ مگ ہوگی۔"

چنانچہ روبینہ نے بھی شاہ کا کلام گایا۔ آواز اچھی تھی۔ گانے کا بھی
ایک اچھا انداز تھا۔ اگر ریاض نے بلا ضرورت اتنی تعریف نہ کی ہوتی تو وہ ہمیں
بھی کوئی رائے قائم کرنے کا موقع ضرور دیتی۔ ایسی بات نہ تھی کہ نظروں پر
نہ چڑھتی۔

اس کے بعد گیروے رنگ کے کپڑے پہنے ایک صاحب آئے اور
وہ بھی سازوں کی مدد سے اپنا رنگ جمانے لگے۔ ایک تو روبینہ کے بعد تالیوں
کی گونج میں ان کے نام کا پتہ نہ چلا۔ دوسرے روبینہ کے بعد انھیں کون سنتا۔

بھٹو صاحب نے یہ بات فوراً بھانپی۔ چنانچہ اس کی قمیص کو کھینچ کر اسے سمجھایا کہ میاں اٹھو اپنا بوریہ بستر سنبھالو۔

بھٹو صاحب جہاں بیٹھے تھے۔ وہ صدر کی نشست کی داہنی طرف تھی اور تمام گانے اور بجانے والے بھٹو صاحب کے سامنے آکر بیٹھتے تھے۔

اس کے بعد جمّن خان نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ جو قدرے برداشت کر لیا گیا۔ حالانکہ میں نے سُنا ہے کہ جمّن خان یہاں کا بہت بڑا آرٹسٹ ہے۔

ابھی جمّن خاں کو اپنے فن کی داد نہیں ملی تھی کہ پریس کے کچھ مقامی لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمیں بھی اشاروں سے اٹھایا گیا۔ حالانکہ صدر اور گورنر کی موجودگی میں یہ بات کچھ مستحسن نہ تھی کہ کوئی بیچ میں اُٹھ کھڑا ہو۔ وہ بھی ابتدائی نشستوں سے ہم بھی کیا کرتے۔ مجبوری تھی۔ سب ساتھ آئے تھے۔ ساتھ جانا تھا۔ اور پھر ہم تھے بھی اتنی دُور کہ بغیر سواری کے اپنے ہوٹل میں پہنچنا محال تھا۔

اپنی بس تک آئے تو اخبار نویس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ والوں سے جھگڑ رہے تھے۔ تُو تُو مَیں مَیں سے بات کچھ اُوپر ہی جارہی تھی۔ نوبت تھکم تھکّا تک تھی۔

اخبار نویس کہتے تھے۔ ہمیں واپس جلد پہنچایا جائے۔ تاکہ ہم اپنے اپنے اخباروں کو رپورٹیں بھجوا سکیں۔ انفارمیشن کے افسران کہہ رہے تھے کہ جو تین چار اخبار نویس باقی رہ گئے ہیں۔ انھیں بھی واپس آلینے دیجیے۔

محکمے کی یہ شکایت بھی بجا تھی کہ آپ حضرات کو کارروائی کے

دوران اٹھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ بہانے کچھ تھے۔ باتیں کچھ تھیں۔ غرض تھڑی تھڑی ہوئی اور خوب ہوئی۔

جو کچھ جاتے ہوئے ہوا تھا۔ وہی واپسی پر دوہرایا گیا۔ اب میں آپ کو پھر اُس تفصیل میں لے جاکر بدمزا کرنا نہیں چاہتا۔ اگر آپ اِس ذکر کو اُس تفصیل کے بغیر مکمل نہ سمجھتے ہوں تو ذرا چند ورق اُلٹ دیجیے اور وہ بیان پڑھ لیجیے کہ جب ہم بھٹ شاہ جانے کے لیے بس میں سوار ہوئے تھے۔

۶
قدم

کوئی گیارہ بجے کے قریب واپس ہوٹل پہنچے تو مجھے صہبا لکھنوی نے بتایا کہ "اُوپر والی منزل میں آپ کو پیر حسام الدین راشدی یاد کر رہے ہیں۔"

بڑے تپاک سے گلے ملے۔ کہا۔ "چلو تمھیں گانا سنوا کے لاتے ہیں۔"

"صاحب گانا بعد میں ہوگا۔ پہلے کھانا کھلوائیے۔"

"اوہو! ـــــ آپ نے ابھی تک کھانا ہی نہیں کھایا۔"

"نہ صرف میں نے نہیں کھایا۔ بلکہ میرے سارے دوستوں نے نہیں کھایا۔" اس پر راشدی صاحب نے منتظمین کو بڑا سخت سُست کہا۔ بلکہ غصے میں ایک بے ضرر قسم کی گالی بھی دے ڈالی۔ مزا آگیا۔ جب کوئی

سنجیدہ آدمی غصّے میں گالی دیتا ہے۔ تو ایک تو وہ خود بھلا معلوم ہوتا ہے اور دوسرے وہ گالی بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بشرطیکہ گالی کسی دوسرے شخص کو دی جارہی ہو۔

طے یہ ہوا کہ جہاں گانا سننے کے لیے جارہے ہیں۔ وہاں کھانا بھی کھائیں گے۔ چنانچہ دو موٹروں میں یہ قافلہ گانا سننے یا کھانا کھانے کیلیے نکلا۔

جس مکان پر پہنچے۔ وہاں جس آدمی نے استقبال کیا۔ وہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ تھے۔ وہاں تو یہ سوٹ بوٹ میں تھے۔ یہاں خاکساروں والی وردی پہن رکھی تھی۔ اگر وہ بولتے نہیں تو میں انھیں جلد پہچان نہ سکتا۔

یہاں ماحول یہ تھا۔ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹیپ ریکارڈر مشین چل رہی تھی۔ گانا ریکارڈ ہونے ہی والا تھا کہ یہ قافلہ پہنچا۔

راشدی صاحب نے ڈاکٹر بلوچ کو مخاطب کرکے کہا "خدا آپ لوگوں کو غارت کرے۔ ابھی تک ان لوگوں کو کھانا تک نصیب نہیں ہوا۔ اگر اور تھوڑی دیر تک نہ ملا۔ تو آپ کا گھر گنجِ شہیداں کا لقب پا جائے گا"

ڈاکٹر بلوچ نے جلدی جلدی آدمی دوڑائے۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ دس بارہ بھوکے آدمی جب کسی کے گھر اچانک آنکلیں تو ظاہر ہے کہ کچھ تو پریشانی ہوگی۔ مگر ڈاکٹر بلوچ ہنس ہنس کے راشدی صاحب کے وار ٹالتے رہے اور ہماری بھوک کو اپنی مسکراہٹوں سے رِجھاتے رہے۔ ایک طرف

حسام الدین راشدی :

ادبی حلقوں میں حسام الدین راشدی مقبول ہیں۔ سیاسی حلقوں میں علی محمد راشدی معروف! جیسے یہاں شغل بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ویسے مزاجوں کے اعتبار سے بھی دونوں بھائی مختلف ہیں۔ جیسے ایک اودھ کا حکمران ہوا اور دوسرا دلوں پہ راج کرنے والا، اتنی ہر دلعزیز شخصیت کم از کم میرے ملنے والوں میں تو خال ہی ہوگی۔

سبھی کے کام آنے والے، سبھی کا غم کھانے والے، سبھی کا بھرم رکھنے والے، سبھی کا ساتھ نبھانے والے، رند بھی ان کے دوست، صوفی بھی ان کے یار، یہ بھی خوش، وہ بھی خوش!

بھوک تھی۔ دوسری طرف مسکراہٹ تھی۔ اور شریف آدمی اِن "علامتوں" کے درمیان خطرہ بن کے لٹک رہے تھے۔

اتنے میں ڈاکٹر بلوچ نے انگریزی میں بتایا کہ استاد کریم بخش بہاول کے بہت بڑے گانے والے ہیں۔ اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے جدِ امجد جس موسیقی کے امام تھے۔ اُستاد بھی اُسی موسیقی کے پرستار ہیں۔ اس پر راشدی صاحب نے سندھی میں کہا۔ جس کا میں نے یہ مطلب سمجھا — "یہ لوگ پہلے ہی بھوکے ہیں۔ اب تم انھیں کلاسیکی موسیقی سُنوا کے، ان کے انتقال کا انتظام نہ کرو۔"

تھوڑی دیر کھانے اور گانے پر "تبادلۂ خیالات" ہوتے رہے۔ کچھ کھانے کے بھوکے تھے۔ کچھ گانے کے، بالآخر ہم ہار گئے۔ وہ جیت گئے — اُستاد کریم بخش نے تان اُڑائی۔

گانا ہو رہا ہے۔ ایک تو زبان سندھی، اُس پہ گانے کا انداز دو سو برس پرانا، لطف کیا آتا۔ ہم بور ہونے لگے۔ مگر ڈاکٹر بلوچ ہیں کہ سر دُھن رہے ہیں۔ گانا ٹیپ ہو رہا ہے۔ راشدی صاحب کو بھی ایسے گانے سے دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے، ایک صاحب سے باتیں شروع کر دیں۔ اس پر ڈاکٹر بلوچ نے ہاتھ جوڑ کر راشدی صاحب کو چُپ کرا دیا۔ راشدی صاحب بھی یہ کہہ کے چُپ ہوئے۔ "ایک تو کمبخت

کھانا نہیں کھلواتا، دوسرے کلاسیکی موسیقی سنواتا ہے۔"

غرض تھوڑی دیر بعد کھانا بھی آگیا۔ کھانا کھایا تو موسیقی کا پروگرام ختم ہوگیا۔ جیسے بھوک اور کلاسیکی موسیقی میں عدم تعاون کا رشتہ ہو۔ یوں نہ ہوتا تو ہم سوچتے تو سہی کہ استاد کو ہم تحسین کلوکیا رہے ہیں۔

رات ایک بجے کے قریب ہوٹل واپس آکر پڑ رہے "گھوڑے بیچ کے سوئے۔"

جب ہم لاہور سے چلے تھے تو خیال تھا کہ اتنی گرمی میں مرجائیں گے مگر صاحب یہاں گرمی تو ہے۔ مگر ہوا اتنی پیاری اور اتنی وافر ہے کہ لطف آجاتا ہے۔

میں نے راشدی صاحب سے کہا۔ "یہاں ہوا ایسی شاندار ہے کہ لطف آجاتا ہے۔ پتہ نہیں جنت میں بھی ایسی ہوگی کہ نہیں؟"

انھوں نے کہا۔ "مجھے جنت کا تو پتہ نہیں۔ مگر یہاں تو ہماری ہوا ہی ہوا ہے۔"

قدم

صبح اٹھے۔

رات کو دیر سے سوئے تھے۔ سفر کی تھکن بھی تھی۔ اس لیے میں

بستر پر ہی لیٹا تھا کہ صہبا لکھنوی اچکن پہنے آ گئے۔ چہکے:

"طفیل صاحب! آپ ابھی تک لیٹے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی فارغ بخاری بھی نہیں ہوئے۔"

میں نے اس مذاق کو سمجھ کر اور بہ ظاہر مسکرا کر کہا۔ "یہ زیادتی ہے۔"

"زیادتی ہے تو ہوا کرے۔ فارغ صاحب اپنا نام بدل لیں۔"

ہوتے ہواتے ہمارے کمرے میں ساری "چنڈال چوکڑی" اکٹھی ہوگئی۔ رات راشدی صاحب کے ساتھ، مشرقی پاکستان سے کوئی غلام مصطفےٰ بھی پہنچے تھے۔ یوں وہاں کے دو ادیب ہوگئے۔ باقی سب کراچی، سکھر، لاہور، ملتان اور راولپنڈی کے تھے یا پھر مقامی!

اتنے زیادہ بقراط، جب ایک جگہ بیٹھے ہوں۔ تو پھر وہاں کیا کیا لطیفہ اور کیا کیا کثیفہ نہ ہوا ہوگا۔ لہٰذا لطیفے لکھتا ہوں۔ کثیفے زبانی سناؤں گا۔

میں نے شوکت صدیقی سے ازرہِ مذاق پوچھا۔ "گلڈ نے جو آپ کو پانچ ہزار کا انعام دلوایا تھا۔ اگر اس میں سے کچھ بچا ہو تو کراچی پہنچنے پر، میری دعوت کر دیجیے گا۔"

"بھئی بچنا کیا تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ ایک لطیفہ ہے۔ پانچ ہزار کا چیک ملا۔ گھر لایا۔ ابھی اُسے بیوی بچوں کو بھی نہ دکھایا تھا کہ ایک صاحب

آنکلے۔ کہنے لگے: "صدیقی صاحب! آپ کے ہاتھ میں روپے آگئے ہیں
اس لیے بزنس کرتے ہیں۔ مکانوں کی قلت ہے۔ لہٰذا اُس روپے سے
ایک مکان بنوا لیتے ہیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد پانچ کے دس ہزار
ہو جائیں گے"۔۔

میں اُن کی باتوں میں آگیا۔ لکھا پڑھی کے بغیر، چیک ان کے نام
منتقل کر دیا۔

مکان بننا شروع ہوا۔ روپیہ ختم ہو گیا۔ کچھ روپیہ انھوں نے
اپنی جیب سے بھی لگایا۔ پانچ مہینوں کے بعد میں نے اُن سے کہا: "اب
دلوائیے دس ہزار"! ۔۔۔ کہنے لگے۔ کیسا روپیہ؟ اگر مجھے کچھ دیا ہے تو
اس کی رسید دکھاؤ"۔

جواب سن کر ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ میں نے گلو گیر آواز میں
کہا: "اگر میں نے آپ پر اعتماد کیا تو اُس کا یہ بدلہ تو نہ دیجیے"۔

انھوں نے کمال دریا دلی سے کہا۔ "اعتماد کیا ہے تو صبر بھی کیجیے۔
اتنی جلدی کیا ہے؟" چنانچہ جب سے اب تک انتظار کر رہا ہوں اور یہ انتظار
شاید عمر بھر کرنا پڑے۔

صہبا چہکے: "شاید کیا۔ بلکہ یقیناً"۔

میں نے حالات سُنے تو دعوت کھانے کا ارادہ، خود ہی دل ہی

دل میں ملتوی کر دیا۔ بھلا ایسے ٹھُن ٹھُن گوپال قسم کے آدمی سے کیا دعوت کھانا۔

شوکت صدیقی، اپنا مآل جان کر تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر موضوع بدل کر بولے۔ "یار یہ ہوٹل والے بڑے یہودی ہیں۔ آپ لوگ تو مزے میں ہیں۔ ہمیں سب سے اُوپر والی چھت پر، جو کمرا دے رکھا ہے۔ اس کی چھت ہی نہیں ہے اور پتہ ہے اس کا کرایہ کیا ہے؟ سولہ روپے روز! اور یہ بھی آپ کو پتہ ہے کہ کل جو کھانا کھایا تھا۔ اس کے باون روپے ادا کیے ہیں۔ رات میں نے ہوٹل والوں سے کہا۔ ایک چارپائی اور ڈال دیجیے۔ کہنے لگے صاحب! اس کے دس روپے الگ ہوں گے۔ بلکہ ان کا یہودی پن یہاں تک ہے کہ ہم جو پانی پیتے ہیں تو اُس کا بھی فی جگ ایک روپیہ وصول کرتے ہیں۔"

آفاق صدیقی نے پریشان ہو کر کہا۔ "بابا اپنی اپنی فکر کرو۔ ہم تو سکھر جاکر پانی پی لیں گے۔"

شوکت صدیقی نے سلسلۂ کلام کو پھر جوڑا۔ "دیکھ لینا۔ جب ہم یہاں سے جائیں گے تو ہمارے سوٹ کیس ہوٹل والوں کے ہاں گروی پڑے ہوں گے یا پھر عالی یا شہاب میں سے کوئی آکر ہمیں ان ظالموں سے چھڑائے گا۔ غضب خدا کا مُرغ کی آدھی پلیٹ چار روپے کی۔"

سب کورس میں بولے ــــ "چار روپے کی ؟"

ریاض انور نے تلملا کر کہا۔" اگر دو روپے کی مرغی خریدیں تو سارا سال انڈے کھا سکتے ہیں ۔"

شوکت صدیقی نے کہا۔" آپ نے انڈے یاد دلا دیئے۔ معلوم ہے یہاں ایک اُبلا ہوا انڈا کتنے کا ہے ؟ پورے چھ آنے کا ؟"

ایک کا لفظ شوکت صدیقی نے اتنا لمبا کر کے ادا کیا۔ جیسے کوئی گویا تان اڑانے والا ہو ـــــ واقعی لٹس کی کوئی حد نہ تھی۔

صہبا پھر میدان میں آگئے۔" ابے چُپ کر، کیوں بور کر رہا ہے ۔"

شوکت صدیقی اور صہبا لکھنوی میں بڑے پیار کے تعلقات ہیں اس لیے شوکت صدیقی نے صہبا کو چھیڑا۔" دیکھ لیجیے ! اس صہبا کے بچے نے صبح ہی سے ہمارا دماغ کھانا شروع کر دیا ہے ۔"

ابے سالے' دماغ میں نے کھانا شروع کر رکھا ہے یا تُو نے اپنے انعام کی کہانی' شوکت کی زبانی شروع کر کے بور کیا ہے۔ اس کے بعد ہوٹل والوں کے پیچھے پڑ گیا۔ تُو نے کونسا بِل اپنی جیب سے ادا کرنا ہے ۔

چُپ بے ! یہ جب بھی کھانے کے لیے بیٹھے گا۔ بکرے کا بھیجا منگوائے گا۔ پھر اس کے بعد ہمارا دماغ چاٹنا شروع کر دے گا۔ کل بھی اس نے بھیجا کھایا تھا۔ چونکہ ابھی تک ملا نہیں۔ اس لیے اُس وقت تک
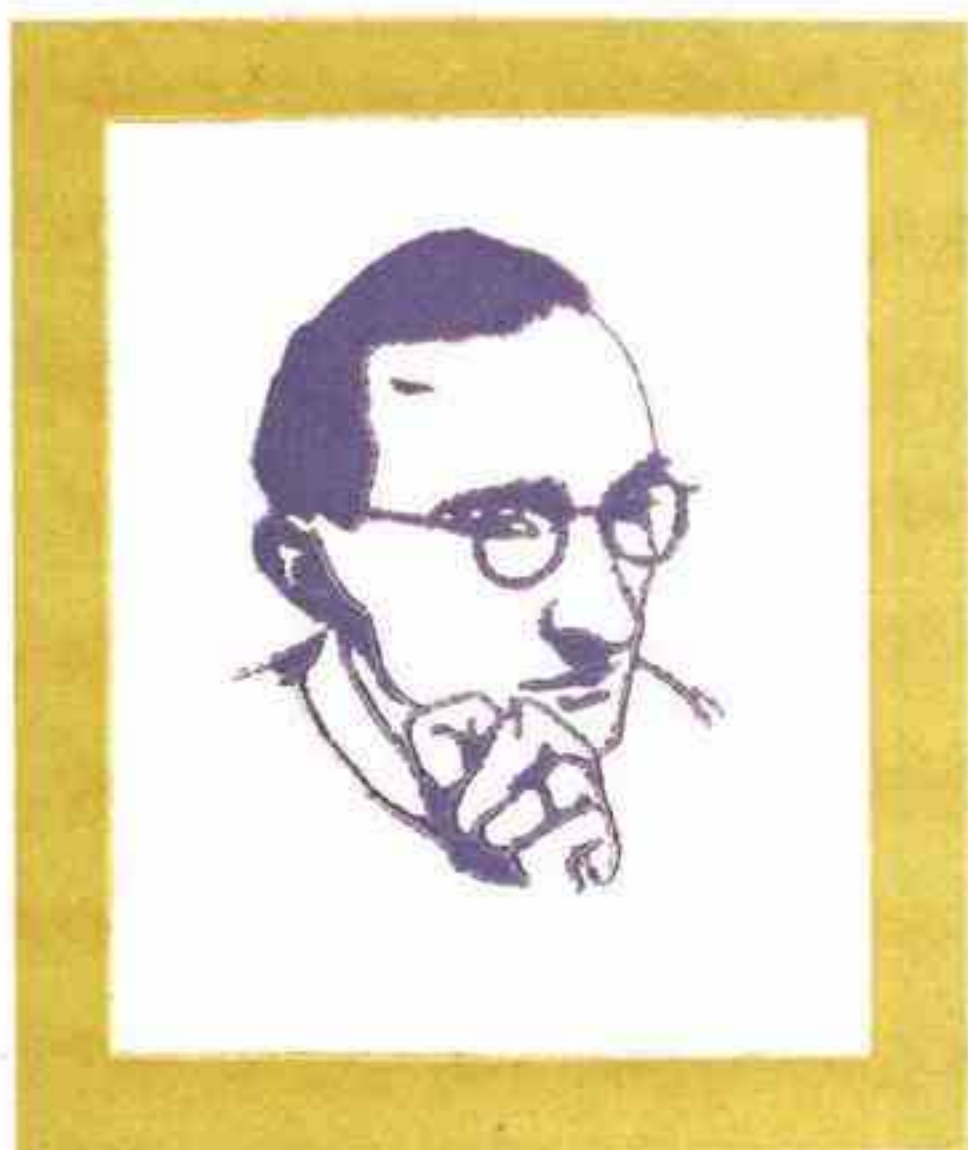
صہبا لکھنوی :

یہ دوسری طرف منہ کیے جا رہے ہوں تو دیکھنے والا یہی کہے گا کہ جیسے کوئی بچہ اچکن پہنے بھاگ رہا ہو۔ سامنا ہو جائے تو ایسے چھا جائیں گے کہ بچہ تو بچہ، بچے کا باپ بھی دم بخود رہ جائے۔ ادب کے سلسلے میں اپنی خدمات کا وہ رونا روئیں گے کہ مخاطب کو بھی رونا آجائے۔ مگر ہڈیوں کے اس ڈھانچے سے، محفلوں کی رونق باقی ہے۔ ملیں گے تو نچھے پچلے جائیں گے۔ نظروں سے اوجھل ہو جائیے تو پھر یہ بھی دور ہو جائیں گے۔

لفظِ "خلوص" کی مالا جتنی یہ جپتے ہیں کوئی دوسرا خلوص کار نہیں جپتا۔

ہمارے دماغ گھائے گا (پھر کچھ فکرمند ہوکر) ہمیں چاہیئے کہ اپنے دماغوں کا بیمہ کرالیں۔ ورنہ یہ کھا جائے گا۔"

۸
قدم

گیارہ بجے کے قریب ہیں، صہبا لکھنوی، شوکت صدیقی، ایوب محسن بذل الرشید، ریاض انور، آفاق صدیقی اور محسن بھوپالی کوٹری بیراج دیکھنے چلے گئے۔ راستے میں آفاق صدیقی اور محسن بھوپالی کی بحث، عبداللطیف بھٹائی کے اجداد اور عہد کے بارے میں چل نکلی۔ اس معاملے میں آفاق صدیقی کا مطالعہ دیسع ہے۔ محسن بھوپالی محض دھونس میں قائل کرنا چاہ رہے تھے۔ مگر آفاق بڑی متانت اور دھیمے لہجے میں محسن کو سمجھا رہے تھے کہ میاں اس معاملے میں ابھی تم بچے ہو۔ مگر محسن اس پر راضی نہ تھے کہ انھیں اس معاملے میں ناسمجھ کہا جائے۔ اس معرکے میں ہم سب کی جان مصیبت میں تھی۔

ریاض انور نے چپکے سے کہا۔"ہم آپ دونوں کو تاریخ سندھ پر اتھارٹی مانتے ہیں۔ اس لیے آپ حضرات ہمارے حال پر رحم فرمائیں۔"

محسن بھوپالی بولے۔"نہیں صاحب رحم کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ آپ حضرات کو ہمارے علم سے استفادہ کرنا چاہیئے۔"

میں نے کہا۔ "یہ اچھی زبردستی ہے کہ مار مار کر، سینوں میں علم اُتارا جائے۔"

شوکت صدیقی نے کہا۔ "یار اس بحث کو چھوڑ دو۔ ورنہ یہ لوگ پھر کبھی اِدھر نہ آئیں گے۔"

شوکت صدیقی کے اس فقرے پر سبھی دو تین منٹ کے لیے خاموش ہو گئے۔ جیسے سوچ رہے ہوں کہ بحث جاری رکھنے میں فائدہ ہے یا بحث ختم کرنے میں!

فضا پُرسکون ہو تو ریاض انور کو صدمہ ہوتا ہے۔ لہٰذا گویا ہوئے۔ "میں کہتا تھا رات کو بیراج چلیں گے۔ مگر کوئی نہیں مانا۔ رات کو سڑک پر روشنی لکیر کی صورت میں نظر آتی ہے۔ جو جمالیاتی ذوق رکھنے والوں کو فنا کر دیتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہم لکیر کے فقیر بننا نہیں چاہتے۔"

ریاض نے جواب دیا۔ "ہم لکیر کے فقیر بنیں یا نہ بنیں۔ گلڈے کے فقیر ضرور رہیں۔"

حیدر آباد سے بیراج کا فاصلہ ۴، ۵ میل ہی کا تھا۔ بیراج آگیا۔ سب موٹر سے اُترے۔ وہاں ہوا اتنی تیز تھی کہ زمین پر پاؤں نہ ٹکتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ ابھی ہوا پاؤں اُکھاڑ دے گی اور ہم اوندھے پڑے

ہوں گے۔ اللہ کا شکر کہ ایسا کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ ورنہ اس سلسلے میں پہل صہبا لکھنوی کرتے۔ ان کی صحت دیکھ کر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے جی رہے ہیں۔ جب یہ باتیں کرتے ہیں تو پھر مخاطب کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے کہ وہ کیسے جی رہا ہے۔

محسن بھوپالی اسسٹنٹ انجنیئر ہیں۔ انھوں نے اس بیراج پر جب یہ زیر تعمیر تھا۔ کام کی بھی نگرانی کی تھی۔ اس لیے بتا رہے تھے کہ یہ سڑک جس پر ہم چل رہے ہیں۔ (دریا کے اُوپر والی سڑک) اسے موجودہ جگہ سے پوری کی پوری اور اُوپر اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ رعایت اس لیے رکھی گئی ہے کہ اگر دریا کا پانی زیادہ اُونچا ہو جائے تو پُل کو بچایا جا سکے۔

وہاں سے دریا کا پانی تین اطراف کو بڑی خوبصورتی سے موڑ دیا گیا تھا۔ جدھر پانی کی ضرورت ہوتی ہے اُدھر پانی کا رخ موڑ دیا جاتا ہے۔ جدھر پانی کی ضرورت نہ ہو، اُدھر پانی جا ہی نہیں سکتا۔ انجنیئروں کی یہ حیرت انگیز سوجھ بوجھ تھی۔ جس سے پانی روکا اور چھوڑا جاتا ہے۔

بیراج کے ایک کونے میں، ایک چھوٹا سا خوبصورت ہوٹل ہے۔ جس کا نام "المنظر" ہے۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے مشروبات سے اپنے آپ کو "ٹھنڈا" کیا۔

ہم چاہتے تھے کہ المنظر کی اُوپر والی چھت پر جا کر بیٹھیں۔ مگر ہمیں

روک دیا گیا کہ اُوپر والی چھت فیملی کے لیے ہے۔ ناچار نیچے بیٹھے کُڑھتے رہے اور سوچتے رہے کہ اگر اس وقت ہمارے ساتھ بھی کوئی خاتون ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اسی لیے میں نے ابھی لکھا تھا کہ المنظر میں بیٹھ کر ہم نے مشروبات سے اپنے آپ کو "ٹھنڈا" کیا۔

چُہلیں ہو رہی تھیں کہ اُوپر سے ایک فیملی اُتری۔ میں اس فیملی کو "فیملا" کہوں گا۔ اس لیے کہ عورت بھی جی بھر کے موٹی تھی اور مرد بھی۔ اس کے بعد ایک اور فیملی اُتری۔ اب بحث شروع ہوئی کہ یہ لوگ انگریز ہیں یا اطالوی۔ شوکت صدیقی نے بڑے تیقّن کے ساتھ فیصلہ کر دیا۔ "بلا وجہ اپنا دماغ نہ کھپائیں۔ یہ لوگ اٹیلین ہیں۔"

یہ تو میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ وہاں اتنی تیز ہوا تھی کہ ہم میں سے کسی کے اُڑنے کا احتمال بھی تھا۔ اطالوی عورتیں اسکرٹ پہنے تھیں۔ جو بُری طرح اُڑ رہے تھے۔ وہ بے چاریاں لطف اندوز ہونے کے ساتھ "اسکرٹ اندوز" بھی ہو رہی تھیں۔ اس منظر سے سارے ادیبوں نے شاید اس لیے دلچسپی لی کہ اگر کبھی اس نوع کے مناظر پر لکھنا پڑے تو مشاہدے میں رتّی بھر سقم نہ رہے۔

منیجر سے اجازت لے کر ہم اُوپر جا پہنچے۔ اس لیے کہ اب میدان صاف تھا۔ اُفوہ! اتنی تیز ہوا کہ اگر کوئی تھوڑی سی مشق کے ساتھ ہاتھوں کو لہرا کر اُڑنا چاہتا تو وہ ایک دو فرلانگ تو اُڑ ہی لیتا۔ اسی لیے تو آفاق صدیقی
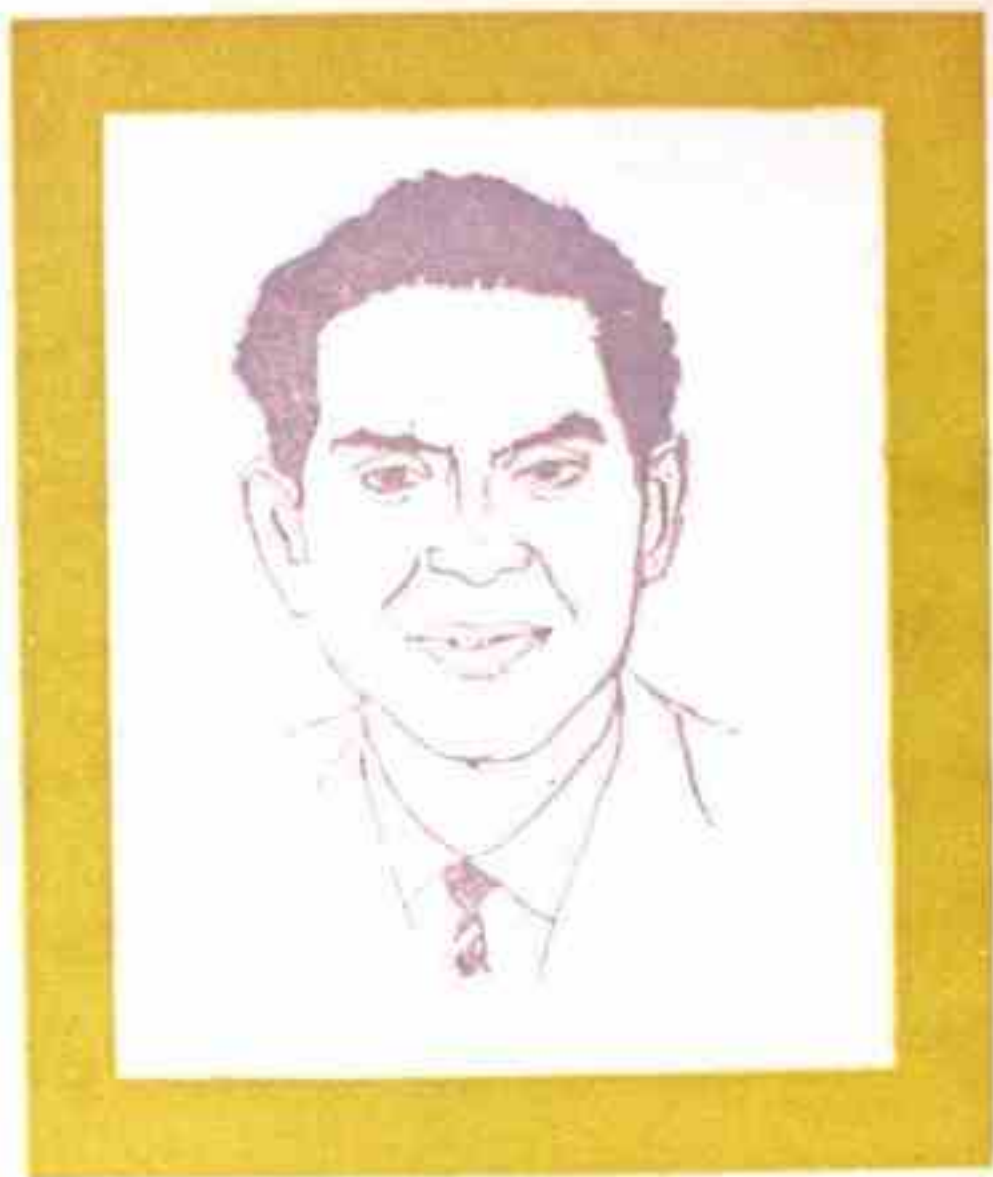
آفاق صدیقی :

یہ اتنے بھلے آدمی ہیں کہ انھیں دیکھ کر ان کی باتیں
سن کر، سر پہ (شفقت آمیز) ہاتھ پھیرنے کو جی چاہتا ہے۔
خلوص ہی خلوص کی انتہا جب خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے
تو وہ آفاق صدیقی کا روپ دھار لیتی ہے۔ مسکرانا اور ڈھیر
ڈھیر سے باتیں کرنا، یہ دو ہی کام انھیں آتے ہیں۔ ویسے یہ
لڑکوں کے پڑھانے پر مامور ہیں۔ مگر لڑکے ہی انھیں سبق دیتے
ہوں تو دیتے ہوں۔ یہ انھیں کیا سبق دیں گے۔
اِتنا اچھا آدمی بھی کوئی نہ ہو۔

نے کہا تھا ۔ صہبا تو حیدر آباد پہنچے کہ پہنچے!

بیراج سے لوٹے تو اپنے ہوٹل کی بجائے کسی دوسرے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اِس لیے کہ ہم اپنے ہوٹل سے ڈرے ہوئے تھے۔ یہاں بِل کُل پندرہ روپے کا بنا۔ وہاں ۵۲ روپے کا، ہم نے پانی بھی بے دھڑک ہوکر پیا۔ اِس لیے کہ یہاں فی جگ ایک روپیہ والا معاملہ نہ تھا۔ بلکہ فی سبیل اللہ والی بات تھی۔

۹
قدم

کوئی پانچ بجے کے قریب انفارمیشن افیسر آئے۔ کہا "تیار ہوجایئے بھٹ شاہ چلیں گے۔"

پوچھا ۔ "آج کا کیا پروگرام ہے؟"

"کچھ مقالے پڑھے جائیں گے۔ گانا بجانا ہوگا۔"

ہماری زندگی میں چونکہ مقالات، افسانے، نظمیں اور غزلیں افراط سے لکھ دی گئی ہیں۔ اِس لیے یہ بات ہمارے لیے کوئی کشش نہ رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے پوچھا ۔ "گانے والوں میں کوئی بڑا آرٹسٹ بھی ہوگا؟"

"ہاں صاحب! سندھ کی کریم آپ کو اسی فنکشن میں ملے گی۔"

اب ہمارے اُس قافلے میں، جو صبح کوٹری بیراج گیا تھا۔ اُس میں جمیل الزّماں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ قافلہ ٹیکسیوں میں چلا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مگر کوئی ایسی بات نہ ہوئی جو قابلِ ذکر ہو۔

جمیل الزّماں نے کہا "آج اُستاد ہمارے ساتھ نہیں ہے۔"

اُستاد سے مراد اختر انصاری اکبرآبادی ہے۔ اس پر ریاض انور نے کہا۔ "وہ تو صبح ہی سے غائب ہیں۔"

"کیوں ؟"

"کل رات جب ہم ہوٹل واپس جا رہے تھے تو اُستاد نے طفیل سے کہا۔ میری کتاب وادیٔ مہران پڑھ لینا۔ دو چار لفظ سیکھ جاؤ گے۔"

اس پر طفیل نے جواب دیا تھا۔ "بے شک دو چار لفظ سیکھ جاؤں گا۔ مگر جو چھ سات الفاظ آتے ہیں۔ انھیں گنوا بیٹھوں گا۔"

جمیل الزّماں نے کہا۔ "بات تو زور دار ہوئی۔ مگر وہ ایسے ہیں نہیں کہ اُن پر کسی بات کا اثر ہو۔ وہ تو ہنس ہنس کر سب کچھ پی جاتے ہیں۔"

ریاض نے کہا "جو کچھ بھی ہو۔ مگر ان کی ساکھ بڑی خراب ہے۔ اس کی وجہ سے پُوری ادیب برادری بدنام ہوتی ہے ـــــ مثلاً ـــــ انھوں نے شیر افضل جعفری سے روپے اس غرض سے لیے کہ مجموعۂ کلام چھپوا دوں گا۔ عرصے تک تو یہ لیت و لعل کرتے رہے۔ جب انھوں نے نوٹس دیا تو بڑی معمولی سی

گیٹ اپ کے ساتھ، اخباری کاغذ پر، مجموعے کو ھڑپ تھاپ کر جعفری کے حوالے کر دیا۔ شیر افضل جعفری نے اپنے مجموعے کو دیکھ کر کہا تھا کہ اپنی زندگی میں دو بار رویا ہوں — ایک بار والدہ کے مرنے پر، دوسری بار اپنے مجموعۂ کلام کے چھپنے پر!

جمیل الزمان نے اختر انصاری کی وکالت کی۔ "مجھے اور کسی بات کا پتہ نہیں۔ ویسے میں اُستاد کے چاہنے والوں میں ہوں۔ وہ تنہا شخص ہے۔ جس نے سندھ میں اُردو کا جھنڈا گاڑ رکھا ہے"۔

محسن بھوپالی نے کہا۔ "اُستاد سے کہیے کہ اب وہ اپنا جھنڈا سندھ سے اکھاڑیں اور اسے لے جا کر پنجاب میں گاڑ دیں"۔

میں نے سوچا۔ اگر یہ بھنک اُستاد کے کان میں پڑ گئی تو کہیں وہ اپنا جھنڈا لے کر پنجاب کا رُخ نہ کر لیں۔ چنانچہ گھبرا کر کہا۔ "ابھی استاد کا کام ادھورا ہے۔ لہٰذا ان کا یہاں سے ہلنا نقصان دہ ہوگا"۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مٹیاری آ گیا۔ مٹیاری حیدر آباد اور بھٹ شاہ کے درمیان ایک گاؤں کا نام ہے۔ وہاں سب نیچے اُترے۔ کسی نے چائے پی۔ کسی نے لیمن؛ محسن بھوپالی نے کھویا خریدا (جو وہاں کی خاص چیز ہے) اور واپس ٹیکسی میں آ کر ہمیں چکھنے کی دعوت دی۔

میں نے کہا۔ "میں نہیں کھاتا۔ موٹروں اور لاریوں کی گرد سے اس کے

محسن بھوپالی :

گندمی رنگت والے، قہقہہ پر قہقہہ لگانے والے، بحث برائے بحث کے عادی، ہیر پھیر کے آرٹ سے عاری، مصلحتوں کے دشمن، دوستوں کے دوست، خوش اطوار، خوش آواز، خوش کلام!

ایک اعتبار سے یہ ادیب اور شاعر نہیں ہیں۔

اس لیے کہ نوکری کرتے ہیں۔

وزن میں اضافہ ضرور ہوا ہوگا۔"

"جناب! میں نے بہت نیچے سے نکال کر خریدا ہے۔ لہذا بے دھڑک کھا بیٹھے۔ گرد کا کیا سوال!"

میں نے ذرا سا چکھا تو دانتوں میں کرچ سی آئی۔ اوروں نے نہ صرف چکھا بلکہ کھایا۔ مجھے اور کھانے کے لیے کہا گیا۔ مگر میں نے انکار کیا۔

"ریت ہے اس میں!"

محسن نے کہا۔ "بالکل نہیں۔ مجھے تو نظر نہیں آتی۔"

"یہ نظر آنے والی چیز کم ہے۔ محسوس کرنے والی زیادہ ہے۔"

اب ہماری ٹیکسی بھٹ شاہ میں، شاہ کے مزار کے سامنے ہے۔"

پہلے آڈیٹوریم میں گئے۔ جہاں سندھ کے کلچر اور سندھ کے رومانوں کے بارے میں آرٹسٹوں کی بنائی ہوئی تصویریں آویزاں ہیں۔ جو قطعی طور پر بچگانہ ہیں۔ سندھ نے بڑے بڑے ذہین آدمی پیدا کیے۔ مگر کام کا آرٹسٹ کوئی نہ پیدا کیا۔

میرے ساتھیوں میں سے بہتوں نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مزار کی زیارت کر رکھی تھی۔ مگر میں اور ایوب محسن اس سے محروم تھے۔ میں نے زور لگایا کہ قبل اس کے کہ پروگرام وغیرہ شروع ہو۔ ہم زیارت کر آئیں۔ ایک دو نے رسّی تڑانا چاہی۔ مگر میں نے کسی کو ہلنے نہ دیا۔ سب چلے۔ ہزاروں آدمی

زیارت کے لیے پہنچے ہوئے تھے۔ زائرین میں وہ سکون اور اطمینان تھا۔ جو میں نے اِدھر نہیں دیکھا۔

میرا خیال تھا کہ یہ عرس جو اتنی شان و شوکت سے منایا جاتا ہے اور جس میں حکومت بھی اتنی دلچسپی لیتی ہے۔ وہ ضرور داتا گنج بخش ہجویری کے عرس سے بڑا ہو گا۔ مگر وہاں وہ بات نہ تھی۔ کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔

جب ہم فاتحہ پڑھ کر واپس ہونے والے تھے تو مغرب کی نماز کے لیے لوگ کھڑے ہو گئے۔ محسن ایّوب نے اپنا بیگ مجھے تھمایا اور خود جا کر نماز میں شریک ہو گئے۔

جب ایّوب محسن اپنا بیگ تھما کر چلے گئے۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے کوئی مجھ سے کہہ رہا ہو" تُو بھی نماز پڑھ لے"۔ مگر میں نے اندر سے اٹھتی ہوئی آواز کو نہ سنا اور اپنے ساتھیوں میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد، مجھے محسوس ہوا کہ جیسے پھر کوئی کہہ رہا ہو۔ "نماز پڑھ لے"۔ مگر میں نے اس بار بھی انجان بننے کی کوشش کی۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ کیا نہ ہوا۔ کچھ پتہ نہیں، چند منٹوں کے بعد، میں بھی سارے نمازیوں کے ساتھ، اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز تھا ۔۔۔ اور اتنا اطمینان نصیب ہوا کہ کیا بتاؤں۔

۱۰
قدم

آج کی نشست کی صدارت کے لیے' ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے، پیر حسام الدین راشدی کو پکارا۔ راشدی صاحب سندھ کے بڑے آدمیوں میں ہوں گے۔ مجھے کیا۔ راشدی خاندان کے ہزاروں مرید ہوں گے۔ مجھے اس سے بھی کوئی غرض نہیں۔ مجھے راشدی صاحب کے اُس علم و فضل سے محبت ہے۔ جو انھیں قدرت نے عطا کیا ہے یا اُس انسانیت سے محبّت ہے جو ان میں پائی جاتی ہے۔

مقالے پڑھے گئے جو درمیانہ درجے کے تھے۔ ان میں کوئی ایک مقالہ بھی ایسا نہ تھا۔ جو قابلِ توجہ ہوتا۔ بہرحال عقیدت کے' نذرانے' تھوڑے سے تھوڑے وقت میں ادا کر دیے گئے۔

اس کے بعد محفلِ موسیقی کا آغاز ہوا۔ میرے برابر سینکڑوں ہی فنکار بیٹھے تھے۔ ان میں بہ ظاہر کوئی اتنا بڑا آرٹسٹ معلوم نہ ہوتا تھا۔ مگر جب وہ ساز سنبھال کر مائیکروفون کے سامنے آتے تھے تو میں زبان اور موسیقی سے کچھ بھی شُدبُد نہ رکھنے کے باوجود گُم ہوتا رہا۔ سب اتنے جذب اور انہماک سے گاتے بجاتے تھے۔ جیسے اس فن میں فنا ہو چکے ہوں۔ جیسے اُن کی یہی

عبادت ہو۔

ایک بڑے میاں میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے اُن پر ترس آرہا تھا کہ لوگ انھیں کیوں اس محفل میں گھسیٹ لائے۔ عمر کوئی سو کے لگ بھگ، آنکھوں سے معذور، مگر جب وہ گانے کے لیے بیٹھے تو ان میں بلا کی حرکت اور مستعدی عود کرآئی۔ میں انھیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوا جارہا تھا۔ یہ تان اُڑائی۔ وہ ہاتھ لہرایا۔ کبھی گردن اور ہاتھ کے اشاروں سے سازوں کا ساتھ دیا کہ لطف آگیا۔ یہیں تک نہیں بلکہ دو ایک موقعوں پر بے خود ہو کر گھٹنوں کے بل قدرے کھڑے ہو کر، ہلکے ہلکے سے ناچ کا جو تصوراتی بیچ دیا تو لوگ آپے میں نہ رہے۔ میں بھی اس نشے کو زندگی بھر نہ بھولوں گا۔

میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا۔

"ان کا کیا نام ہے؟"

"ان کا نام پنڈت نارو ہے۔ ہندو ہیں۔ بڑا اعلیٰ درجے کا گاتے ہیں۔ صدر سے انعام بھی پاچکے ہیں۔"

اس کے بعد ایک دو اور ٹولیاں آئیں۔ جنھوں نے سازوں کے ذریعہ شاہ کا کلام لہرایا۔ کچھ نہ سمجھنے پر بھی بے حد لطف آیا۔ نشہ سا تو اس وقت سے طاری تھا۔ جب میں فاتحہ کے لیے مزار پر پہنچا تھا۔ اب مجھے گانے کی ہر تان اور ساز کی ہر لہر کے ساتھ سر دھلنے لگا۔

ہم نے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ والوں سے کہہ رکھا تھا کہ ہمیں ساڑھے نو بجے کے قریب واپس پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے سب کو اشاروں سے اُٹھا لیا۔ یا سب اس کے منتظر ہی تھے کہ اشارہ پاتے ہی اٹھیں۔ مگر میں تھا کہ بُت بنا بیٹھا رہا۔ پہلے میرے ساتھیوں نے اُٹھنے کے لیے اشارے کیے۔ پھر خود آ کر جھنجھوڑا۔ مگر میں نے اُٹھنے پر رضا مندی ظاہر نہ کی۔

اشاروں اور اصرار کو دیکھ کر راشدی صاحب نے مجھے بلایا اور پوچھا۔ "کیا آپ جانا چاہتے ہیں؟"

میں نے جواب نفی میں دیا۔

اس پر راشدی صاحب انفارمیشن آفیسر پر گرم ہو گئے "آپ لوگ اپنی جان چھڑانے کے لیے مہمانوں کو لے جانا چاہتے ہیں۔ میں آپ لوگوں سے سمجھ لوں گا۔" اس کے بعد مجھے کہا۔ "آپ بیٹھیں۔ میں آپ کی واپسی کا بندوبست کر دوں گا۔"

حاجی نیاز، جو ہمیں لانے اور لے جانے کی خدمت پر مامور تھے وہ شریف آدمی تھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ میری وجہ سے نیاز صاحب کو سخت سُست کہا گیا۔ اس کے بعد میں ابھی نچنت ہو کے بیٹھا ہی تھا کہ ریاض انور میرے پاس آئے۔ کہنے لگے "اُٹھو یار سب لوگ آپ کے انتظار میں کھڑے ہیں۔"

میں راشدی صاحب سے نظریں بچاکر، بادلِ نخواستہ اس محفل سے اُٹھا۔ جو میرے لیے حد درجہ ذہنی اور قلبی سکون کا موجب بنی ہوئی تھی۔

جب ہم ٹیکسیوں میں بیٹھ گئے تو حاجی نیاز نے مجھ سے کہا۔ "طفیل صاحب آپ کی وجہ سے راشدی صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ جو کہ بُرا ہوا۔"

میں نے نیاز صاحب سے کہا۔ "یہ بات آپ بھول ہی جائیں۔ آپ سے کوئی کچھ نہ کہے گا — اس وقت بھی مجھے آپ کی پریشانی اور پارٹی ڈسپلن کا پاس اُٹھا کے لایا ہے، ورنہ مجھے اگر صبح تک بھی بیٹھنا پڑتا تو بیٹھتا۔"

ہوٹل پہنچنے سے پہلے ایک اور ہوٹل میں پہنچ کے کھانا کھایا۔ ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ کھانے کی بجائے باتوں سے پیٹ بھرنے کی کوشش کی۔ اس لیے کہ ہوٹل میں تقریباً سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ جو کچھ تیلیوں کے ساتھ اٹکا اٹکایا باقی تھا۔ وہ صبر اور شکر کر کے کھایا۔ اس کے بعد واپس آ کر نیند پہ غصہ اُتارا۔ راستے میں ایک کُتا ملا۔ ہم میں سے کسی نے اُسے بھی کس کے روڑا مارا تھا۔ اس کی چیں بول گئی۔ مگر ہماری بھوک میں کمی نہ ہوئی۔

طے ہوا تھا کہ صبح ہی صبح ہم سب کراچی چلے جائیں۔ ۶ ½ بجے والی گاڑی سے، مگر میں ڈٹ کے سویا رہا۔ کراچی جانے والے ساتھی تیار ہو گئے۔

رات پروگرام یہ بھی بنا تھا کہ صبح ڈائرکٹر انفارمیشن سے دو دو ہاتھ کر لیے جائیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اگر لڑائی ضروری ہے تو پھر اتنی صبح

جانے کا پروگرام عملی صورت اختیار نہ کرسکے گا۔ اس لیے مزے سے بیٹھا رہا۔ کیونکہ میرا خیال یہ تھا کہ کراچی جانا اتنا ضروری نہیں ہے جتنی کہ معرکہ آرائی!

قصہ یہ تھا کہ گلڈ کے خرچ پر پہنچے تھے۔ یہاں کی رہائش اور کھانے کا انتظام انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے تھا۔ انفارمیشن والے کہتے تھے ہمارے پاس گنجائش نہیں ہے۔ روپیہ نہیں ہے۔ ہم کیا کریں۔ اور یہ بھی کہ یہ کام تو شاہ عبداللطیف بھٹائی کے سیکرٹری کا تھا کہ وہ آپ کو سہولتیں بہم پہنچاتے۔ بہرحال دونوں متعلقہ حضرات موجود تھے اور اپنی اپنی معذوریوں کا اظہار کر رہے تھے۔

رات جب لڑائی جھگڑے والے پروگرام کے بارے میں سوچا جا رہا تھا تو میں نے اپنے ساتھیوں پہ نظر دوڑائی اور پھر ان سے کہا "محاذِ جنگ سے پہلے ایک نقشہ بنا لیجئے کہ کس کس کو حملہ کرنا ہے اور کون کون سے ہتھیار استعمال کرنے ہیں۔"

انھوں نے مجھی سے سوال کر دیا "آپ ہی بتائیں کچھ؟"

میں نے بڑی دیانت دارانہ رائے دی۔ ہم میں زیادہ لڑنے والے اور زیادہ جھک جھک کرنے والے دو آدمی ہیں۔ ایک صہبا لکھنوی، دوسرے ہمارے وکیل ریاض انور۔ اگر یہ بھی اللہ کے شیر کامیاب نہ ہوئے تو پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہم میں سے کسی کی دال گلے۔

میں ابھی لیٹا ہوا ہی تھا کہ نیچے کمرے میں صہبا صاحب کی تُوں تڑاں قسم کی باتیں سنائی دیں۔ ہمارا شیر حملہ آور تھا۔ مر گئے، مر گئے کا شور بپا تھا۔

ہمارے لیٹے ہی لیٹے "یاروں نے معرکہ سر کر لیا۔ تمام اخراجات، انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کے ذمہ ہو چکے تھے۔ کہاں ہم جان چھڑانے کے لیے چندہ اکٹھا کر رہے تھے۔ کہاں یہ چھبن محسوس ہونے لگی کہ اخراجات ڈیپارٹمنٹ ہی کو ادا کرنے تھے تو پانی ہی جی بھر کے پی لیا ہوتا۔

معرکہ سر کر کے صہبا ہمارے کمرے کی طرف پلٹے۔ "اماں طفیل اُٹھو تم نے تو لکھنؤ کے بانکوں کو بھی مات کر دیا۔" یہ سننے پر بھی میں چپکا لیٹا رہا۔

صہبا پھر چیخے۔ "میں کہہ رہا ہوں۔ گاڑی نکل جائے گی۔"

میں پھر بھی آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ حضرات اُس لطف کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے جو صہبا کو ستانے میں ملتا ہے۔

اب صہبا کی آواز میں منّت سماجت کا انداز تھا۔ "پیارے اُٹھو۔ ورنہ مارے جائیں گے۔" اس پر میں نے اُٹھ کے دیکھا تو سبھی تیار تھے اور صہبا کے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ جیسے گاڑی نکل گئی تو صہبا کی جان بھی نکل جائے گی۔

واقعی وقت تھوڑا تھا۔ اس لیے جلدی جلدی تیار ہوا۔ اتنی جلدی کہ جس میں تھوڑی سی معجزانہ قسم کی عجلت شامل ہو۔

راستے میں شوکت صدیقی کو شرارت سوجھی۔ "یار ابھی آم لینے ہیں،

صراحیاں لینا ہیں۔ ورنہ سالا ناراض ہو جائے گا۔"
صہبا چہکے ۔" ابے تو بیوی ہی سے خوشگوار تعلقات رکھ، سالے کی پروا نہ کر۔"
جب ہم پہنچے۔ گاڑی اسٹیشن پر کھڑی تھی۔

۱۱
قدم

جی چاہتا ہے کہ حیدرآباد چھوڑنے سے پہلے اس جگہ کا حق ادا کروں، اس کا قرض چکاؤں۔ قرض اور حق سے میری مراد یہ ہے کہ میں جس جگہ آیا ہوں۔ جن کے لیے آیا ہوں۔ ان کے بارے میں کچھ تو کہوں۔
یہ ٹھیک ہے کہ میرا موضوع یہ نہیں کہ میں سندھ کی تاریخ لکھنے بیٹھ جاؤں یا میں اُس وقت کی، سماجی حیثیت پر گفتگو کروں۔ یا شاہ صاحب ہی کے بارے میں لمبی چوڑی باتیں چھیڑ دوں — جہاں یہ سب کچھ مناسب نہیں — وہاں مناسب یہ بھی نہیں کہ گپ شپ کر کے گھر لوٹ جاؤں۔
لکھنے تو لگا ہوں۔ اب ڈر یہ ہے کہ اس اجمال کی اگر نوک پلک
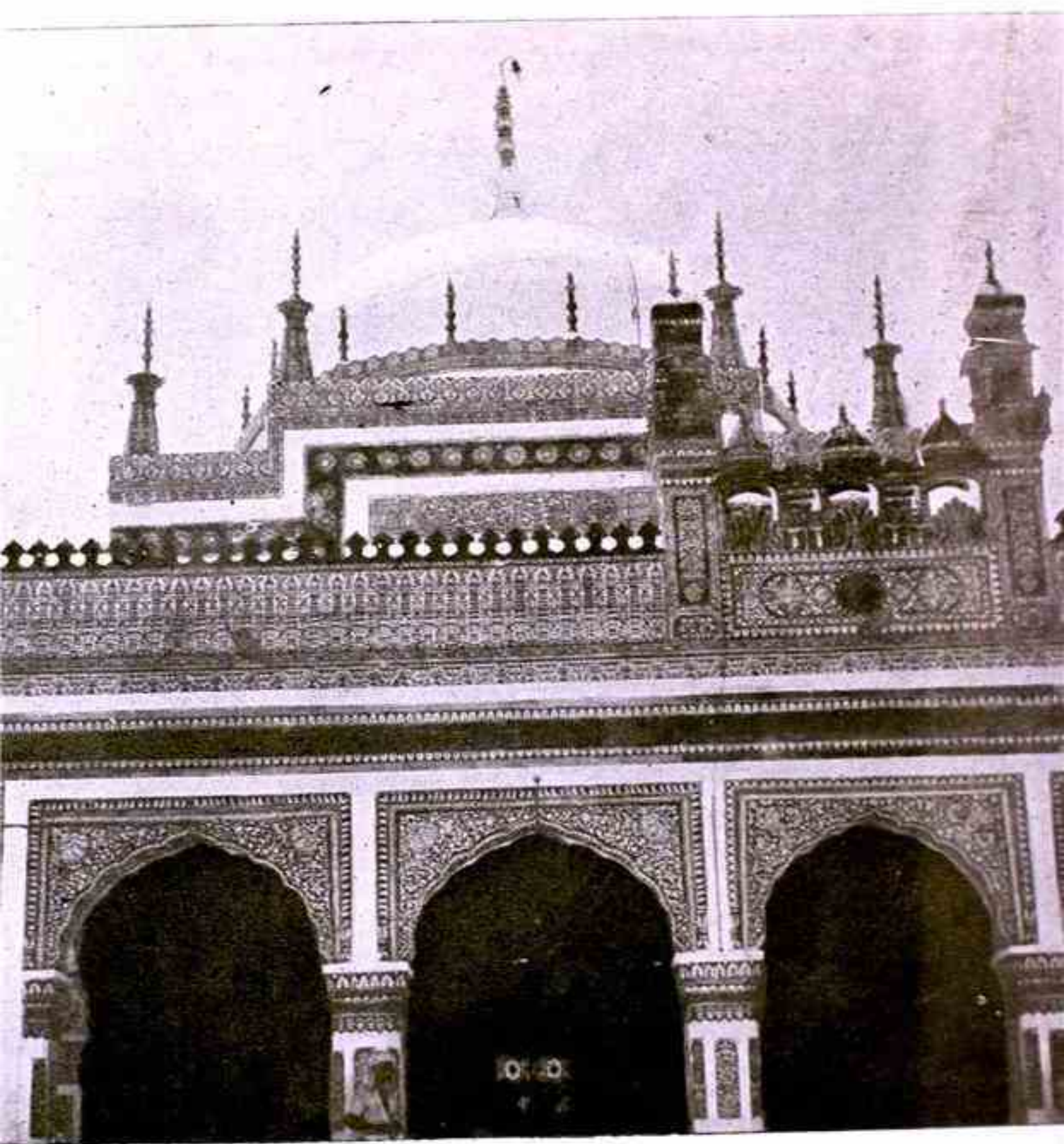
مزار

آڈیٹوریم

درست کرنے بیٹھا - باربط اور بے ربطی کے چکر میں پڑا تو یہ مواد، موجودہ کتابی ضخامت سے دُگنا ہو جائے گا - لہذا وہ یادداشتیں، وہ واقعات، جنہیں دوستوں کی گفتگو سے چرایا - یا جنھیں تقریروں اور تحریروں سے اُڑایا - انھیں جُوں کا توُں لکھے دیتا ہوں - صرف سرسری سے جائزے کی خاطر صرف سرسری سے پس منظر کے طور پر —!

پہلے کچھ تاریخ سندھ کے بارے میں :

○ موئن جو ڈرو کے کھنڈرات اب سے قریب قریب ساڑھے چار ہزار برس پہلے کے ہیں -

○ خیر پور کے نزدیک ایک قدیم تاریخی مقام کوٹ ڈیجی ہے - ۱۹۵۵ء میں پہلی بار کھدائی کی گئی جو اب تک جاری ہے - کوٹ ڈیجی کے کھنڈروں اور بہت سی دوسری زمین دوز چیزوں سے اندازہ یہ لگایا گیا ہے کہ اس تہذیبی مرکز کے اصلی باشندے، اب سے کوئی پانچ ہزار سال پہلے وادئ سندھ میں آکر آباد ہوئے تھے - جو قریب قریب چھ سو سال تک یہاں رہے - اس کے بعد موئن جو ڈرو کے باشندوں نے ان پر حملہ کیا اور انھیں بھگا کر خود یہاں آباد ہو گئے -

○ اب سے قریب قریب تین ہزار سال پہلے وادئ سندھ میں ویدک عہد اور آریائی تہذیب کا آغاز ہوا -

○ اہلِ ایران کے وادیٔ سندھ کے لوگوں سے گہرے تعلقات تھے۔ عرصۂ دراز تک ایرانی فرمانروا، وادیٔ سندھ سے نہ صرف دولت حاصل کرتے رہے۔ بلکہ اہلِ سندھ کی کثیر تعداد ان کے فوجیوں میں بھی شامل رہی۔ شاید اسی لیے جب سکندرِ اعظم نے ایرانیوں سے انتقام لینے کی غرض سے ایران پر حملہ کیا تو اس حملے کی لپیٹ میں وادیٔ سندھ کا بیشتر حصہ بھی آگیا۔ یونانی فاتحین نے سندھیوں پر جو ظلم روا رکھے۔ اُن کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ کے لوگ یونانیوں سے شدید نفرت رکھتے تھے۔

○ یونانیوں کے بعد سندھ کی دولت کو لوٹنے کے لیے ستھین، پارتھی، یوچی، ہن، ساسانی اور کچھ دوسری قوموں نے بھی حملے کیے۔ مگر حملہ آور قومیں یہاں کی تہذیب و تمدن میں جذب ہوتی گئیں۔

○ ۲۵۰ (ق۔م) کے قریب سندھ راجہ اشوک کی حکومت میں شامل رہا۔ اور اس دور میں یہاں بدھ کی تعلیمات اور پالی زبان کا رواج ہو گیا۔

○ گپت خاندان کے بعد رائے خاندان کے راجاؤں نے ۴۵۰ء سے ۶۶۳ء تک سندھ پر حکومت کی۔ یہ لوگ مہاتما بدھ کے پیرو تھے۔ ان کے دور میں سندھ چار صوبوں میں تقسیم تھا۔ (۱) برہمن آباد (۲) سیوستان (۳) اسکندہ (اُچ) (۴) ملتان، ان صوبوں کی حفاظت کے لیے مضبوط قلعے

تھے ۔حکومت کے خزانے بھرے ہوئے تھے اور ہر طرف خوش حالی کا دور تھا ۔

○ ۶۶۲ء سے ۷۱۱ء تک سندھ پر برہمن خاندان کی حکومت رہی ۔ راجہ داہر اسی خاندان کا راجہ تھا ۔جو ۶۷۹ء میں تخت پر بیٹھا ۔ داہر بودھ دھرم کے ماننے والوں کا سخت مخالف تھا ۔اس نے انتقاماً ایسے قوانین نافذ کیے جو بودھوں کے لیے بڑے تکلیف دہ ثابت ہوئے اور ان کی اکثریت برہمنی حکومت کے مخالف ہوگئی اور انھوں نے خفیہ طور پر حجّاج کی مدد حاصل کرنے کے لیے قاصد روانہ کیے ۔ اسی زمانے میں داہر نے ان بحری قزاقوں کو پناہ دی ۔جنھوں نے راجہ سراندیپ کے جہازوں کو لوٹا ۔ ان جہازوں میں قیمتی تحائف کے علاوہ عرب تاجروں کی بیوہ عورتیں اور بچے سوار تھے ۔

○ حجّاج کے حکم سے محمد بن قاسم نے سندھ پر برّی اور بحری راستے سے حملہ کیا ۔ داہر نے شکست کھائی اور مارا گیا ۔ سندھ پر عرب فاتحین کا قبضہ ہوگیا ۔بہت سے عربوں نے سندھ کو اپنا وطن بنا لیا اور اشاعتِ اسلام میں ہمہ تن منہمک ہو گئے ۔ سندھ اس لیے باب الاسلام بھی کہا جاتا ہے ۔حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہدِ خلافت میں سندھ کے لاتعداد ہندوؤں نے اسلام قبول کیا ۔

○ عربوں کی باہمی خانہ جنگی کی وجہ سے سندھ چھوٹی چھوٹی خودمختار

ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ کچھ عرصہ طاہریہ اور نفاریہ فرقے کے لوگوں کا تسلط رہا۔ پھر فاطمی تحریک نے زور پکڑا۔ منصورہ اور ملتان پر فاطمیوں کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن ۱۰۲۴ء کے قریب محمود غزنوی کے حملے نے فاطمیوں کو شکست فاش دے کر گجرات کی طرف بھگا دیا اور سندھ پر غزنوی حکومت قائم ہو گئی۔

○ ۱۱۷۶ء میں شہاب الدین غوری نے سندھ پر قبضہ کیا اور اپنے غلاموں میں سے ایک غلام ناصرالدین قباچہ کو ملتان اور سندھ کا حاکم مقرر کیا۔

○ غلام خاندان کے بعد سندھ پر خلجیوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ جو ۱۲۹۰ء سے ۱۳۲۰ء تک قائم رہی۔

○ خلجیوں کے بعد تغلقوں کی حکمرانی کا دور آیا۔ جس کا خاتمہ ۱۳۹۸ء میں تیمور کے حملے سے ہوا۔

○ امیر تیمور کے زمانے میں ہرات کے ایک بزرگ سیّد میر علی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ ۱۳۹۸ء میں جب تیمور ہرات آیا تو سیّد صاحب نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ تیمور اس حسن سلوک سے بے حد متاثر ہوا۔ سیّد صاحب اور ان کے دو بیٹوں ابوبکر اور حیدر شاہ کو مصاحبین خاص میں شامل کر کے ہندوستان لے آیا۔ ابوبکر کو سندھ کے زیرین علاقے کا حاکم مقرر کیا۔ سیّد میر علی اور حیدر شاہ کو اپنے ساتھ رکھا۔ بعد میں سیّد حیدر شاہ بھی اپنے والد بزرگوار اور تیمور کی اجازت سے گھومتے پھرتے سندھ کی طرف آئے اور "ہالا" کے

علاقے میں شاہ محمد زمیندار کے مہمان ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے اپنی لڑکی کی شادی آپ سے کر دی۔ انھیں میاں بیوی سے سندھ میں شاہ لطیف کے خاندان کی ابتدا ہوئی اور اس خاندان میں شاہ لطیف کے علاوہ شاہ کریم، سید ہاشم اور سید جلال جیسے ذی علم بزرگ پیدا ہوئے۔

غزنوی دور سے تغلق دَور تک سندھ میں سومرہ خاندان (۱۱۵۲ء تا ۱۳۵۱ء) کا اقتدار رہا۔ چونکہ سومرہ سردار بہت ظالم تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سَمہ خاندان نے آخری سومرہ حاکم ہمیر سومرو کو قتل کر کے اپنا اقتدار قائم کر لیا۔

سندھ میں عمر ماروی کا جو قصّہ مشہور ہے۔ اس کا تعلق سومرو کے عہد ہی سے ہے۔ عمر خود بھی ایک سومرو سردار تھا۔ جو تھر کے علاقے کا حاکم تھا اور اس کا پایۂ تخت "عمرکوٹ" تھا۔ جہاں ماروی کو اغوا کر کے قید کر دیا گیا تھا۔

سومروں کی طرح سَمہ خاندان کے لوگ بھی اصل سندھی تھے۔ سَمہ سرداروں نے نہایت عدل و انصاف سے حکومت کی۔ سَمہ سرداروں نے ۱۳۵۱ء سے ۱۵۲۶ء تک حکومت کی۔

سَمہ خاندان کا اقتدار اس وقت ختم ہوا جب ۱۵۲۶ء میں بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ جب بابر نے کابل فتح کر کے قندھار پر حملہ کرنے

کا ارادہ کیا تو قندھار کے حاکم شاہ بیگ ارغون نے سندھ پر قبضہ جمانے کی سوچی اور اس طرح سندھ پر ارغونوں کا قبضہ ہو گیا۔ جو مغل تھے۔

○ ارغونوں کے بعد ایک اور مغل خاندان سندھ پر حکمران رہا جس کا تعلق مرزا عیسیٰ ترخان سے تھا۔ سندھ پر ترخانوں کی حکومت عہدِ اکبری میں ختم ہوئی۔ جب ترخان خاندان کے آخری حاکم مرزا جانی بیگ نے اکبری لشکر کے ہاتھوں شکست کھائی اور سندھ مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔ اس فتح کا سہرا مرزا عبدالرحیم خان خاناں کے سر تھا۔ جو عرصے تک سندھ کے گورنر رہے۔

(اس کے بعد شاہ عبداللطیف کے جدِ امجد تاریخ کے صفحات پر ابھرتے ہیں۔ جن کا ذکر آگے جا کر کروں گا۔ مگر یہاں چند واقعات اور بھی لکھ دینا چاہتا ہوں)

○ اورنگ زیب کی وفات تک سندھ مغلیہ سلطنت میں شامل رہا۔ لیکن ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے حملہ کیا تو سندھ ایرانی حکومت کے تابع ہو گیا۔ ساتھ ہی ساتھ سندھ میں کلہوڑہ خاندان نے عروج حاصل کیا۔

○ ۱۵۹۱ء میں خان خاناں نے مہدوی تحریک کے ایک سندھی علمبردار میاں آدم شاہ کلہوڑہ کو ایک جاگیر فقیروں کے لنگر خانے کے لیے دی تھی۔ رفتہ رفتہ کلہوڑہ خاندان کے پیر اپنے مریدوں میں اضافہ

کرتے رہے۔ آخر کار یار محمد کلہوڑہ کو ۱۷۰۱ء میں دہلی کے مغلیہ دربار سے سندھ پر حکومت کرنے کا پروانہ ملا۔

○ ۱۷۸۳ء میں تالپور امیروں نے جو کلہوڑوں کے مُرید تھے۔ سندھ پر قبضہ کر لیا۔ سندھ پر تالپوروں کی حکومت ۱۸۴۳ء تک قائم رہی۔

○ ۱۸۵۷ء کے غدر سے کچھ پہلے سندھ پر انگریزی حکومت قائم ہو گئی ـــ یہ ہے مختصر سی تاریخ سندھ کی، انگریزوں کے آنے تک۔

۱۲
قدم

اب شاہ عبداللطیف کے زمانے کا جو سماجی پس منظر تھا۔ اس کا حال سن لیجیے :-

○ ان کے زمانے میں جاگیرداری، زمینداری اور پیری مریدی کو اہم سماجی عوامل کی حیثیت حاصل تھی۔ جاگیردار اپنی جاگیروں کے خود مختار فرمانروا تھے۔ عالیشان حویلیوں میں رہنا، بے شمار گھوڑوں اور اونٹوں کا رکھنا، سیر و شکار، لہو و لعب اور عیش و عشرت میں وقت گزارنا، غریب اور پسماندہ عوام پر طرح طرح کے ظلم ڈھانا، خوشامدی مصاحبین کی چکنی چپڑی باتوں اور خوشامد سے خوش رہنا۔ رقص و موسیقی کے مشغلوں سے جی بہلانا، صاحبِ اثر

لوگوں کے معمولات میں داخل تھا۔ غرض کوئی دنیوی عیش ایسا نہ تھا جس کے وہ بادشاہ نہ تھے۔

○ جاگیرداری اور زمینداری کے ساتھ ساتھ پیری مریدی کے چکر تھے۔ غریب اور سادہ لوح عوام کی اوہام پرستی کی وجہ سے ریا کار پیروں فقیروں کو بھی وہی عیش حاصل تھے۔ جو جاگیرداروں اور زمینداروں کے لیے ارزاں تھے۔ شاہ نے بھی اپنے کلام میں، کئی جگہ ان نام نہاد پیروں کی ریاکارانہ زندگی کے پول کھولے ہیں۔

○ شاہ کے زمانے میں برصغیر کے دوسرے علاقوں کی طرح سندھ میں بھی زرعی معیشت کا دور دورہ تھا۔ زیادہ آبادی دیہی علاقوں میں تھی۔ جو کسانوں، چرواہوں، چھوٹے دکانداروں، مچھیروں اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے پس ماندہ افراد پر مشتمل تھی۔ شاہ کے کلام میں ان تمام عوامی پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ ذکر ان عادات و خصائل اور پیشہ ورانہ لوازمات کے ساتھ ہے۔ جو بنیادی طور پر ان محنت پیشہ لوگوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً جہاں کہیں شاہ نے لوہاروں کا ذکر کیا ہے۔ وہاں دھونکنی، ہتھوڑا، بھٹی، اور سندان وغیرہ کی نشان دہی بھی کی ہے۔ اسی طرح اور جتنے پیشوں کے لوگوں کا ذکر شاہ کے کلام میں ہے۔ وہ بھی ان تفصیلات کے ساتھ ہے۔ جو ان پیشوں سے منسوب ہو سکتی تھیں۔ اس اعتبار سے شاہ قطعی طور

پر عوامی شاعر تھے۔ عوام کے تھے۔ اس لیے کہ ان کے دکھ درد میں شریک تھے۔

سندھ کے دیہی علاقوں کے پسماندہ عوام سماجی طور پر طرح طرح کی مجبوریوں کا شکار تھے۔ لیکن پھر بھی مذہبی اقدار کا ان کو اتنا لحاظ تھا کہ ان تمام رسومات کی پابندی کرتے تھے جو انھیں اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملی تھیں مثلاً شرعی فرائض کے علاوہ مزاروں پر پھولوں اور موتیوں کی چادریں چڑھانا، تعویذ اور نذر و نیاز کی برکتوں پر ایمان رکھنا، خود بھوکے رہنا لیکن پیروں کو نذرانے دینا اور پیروں کے ہر حکم کو تہِ دل سے ماننا۔ وہ ایک طرف تو جاگیرداروں اور زمینداروں کے ظلم و جور کا شکار رہتے۔ دوسری طرف رہی سہی کمائی، پیروں کے کام آتی اور اس طرح ان کی اپنی زندگی بڑے حالوں گزرتی۔

تجارت زیادہ تر ہندوؤں کے لیے مخصوص تھی۔ ہندوؤں کے مذہبی و معاشرتی رسم و رواج مسلمانوں سے مختلف تھے۔ پھر بھی سندھ کے ہندوؤں کی یہ ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ وہ چھوت چھات کے قائل نہ تھے مسلمان پیروں اور فقیروں سے انھیں بے حد عقیدت تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جوگ، یوگ اور بھگتی وغیرہ کی تحریکوں کا اثر سندھ پر بہت گہرا تھا۔

بدھ مت کا اثر کئی صدیوں تک سندھ پر رہا تھا۔ اس لیے عوام کے مزاجوں میں متصوفانہ اقدار کا خمیر پہلے سے موجود تھا۔ اسلامی تصوف نے

اسے ایک نیا رنگ دیا۔ سندھ میں تصوف کا عمل دخل کچھ اس طرح رہا کہ دیہی علاقوں کے سادہ لوح محنت کش سے لے کر اُونچی حویلیوں میں پروان چڑھنے والوں تک نے اسے تہ دل سے قبول کیا۔ شاید اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ "سندھ صوفیوں کا دیس ہے"۔

یہ ٹھیک ہے کہ شاہ نے اپنے جُزبیں مشاہدے اور درون بینیُ احساس کی مدد سے اَن گنت سماجی عوامل کو روحانی رمز و نکات کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تاہم ان کے کلام کی ہمہ گیریت ایک منظوم ثقافتی اور تمدنی داستان ہے۔

اس میں رنگا رنگ تصویریں اُبھرتی ہیں۔ مثلاً بحری مسافروں، ملّاحوں اور ماہی گیروں سے تعلق رکھنے والی بادبانی کشتیوں اور ان کشتیوں کے مختلف حصّوں جیسے چپّو، رسّیاں، کِلّے اور لنگر وغیرہ کا استعمال، بحری مسافروں اور ملّاحوں کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ان کے گھر والوں کی منت اور سماجت، پھر واپسی تک انتظار کی بے چینی، واپس آنے کے بعد گھر والوں کی خوشی، مختلف طریقوں سے اس خوشی کا اظہار، لیکن ساتھ ہی یہ فکر بھی کہ انھیں دوبارہ سفر پر روانہ ہونا ہے ـــــ

اُن چرخہ کاتنے والیوں، کپڑا بُننے والوں اور سوت کا کاروبار کرنے والوں کی کاروباری اور نجی زندگیوں کا عکس، جو سندھ کی محدود زرعی معیشت اور

سندھی معاشرت میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

اُن خانہ بدوش چرواہوں اور کاشتکاروں کی جھونپڑی میں بسر ہونے والی زندگی جو بے سروسامانی اور خشک سالی کے زمانے میں بھی ہمت نہ ہارتی ـــ

برسات ہونے سے پہلے ان کی پُر امید دعائیں اور برسات کے بعد امنگوں، آرزوؤں اور فطری مسرّتوں کا جوش جو سارے دُکھ درد دُور کر دیتا تھا۔

اُن گداگروں اور سیلانی موسیقاروں کی زندگی کا حال جو بستی بستی گھومتے پھرتے ـــ

اُن جوگیوں اور سادھوؤں کا بیان جو بستیوں سے تیرتھوں کی طرف روانہ ہوتے ـــ

اُن قلندروں، ملنگوں، فقیروں اور مستوں کا نمائشی پندار، جو سادہ لوح عوام کو اپنی عجیب عجیب حرکات سے متاثر کرتا اور اُن کی ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اٹھاتا ـــ

اور ان خدارسیدہ بزرگوں کا بھی احترام جو دنیاوی حرص و ہوا سے بے نیاز ہو کر علم و عرفان کی تلقین کرتے، اور اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دیتے۔

اور:

شاہ نے جن عشقیہ داستانوں کو منظوم کیا ہے۔ ان سے بھی ادئ سندھ کی سماجی زندگی کے بہت سے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ مثلاً سسّی پنّوں کی کہانی میں سندھ اور بلوچستان کے علاقوں میں تیز رفتار اونٹوں کے کارواں اور ان کی منزلیں، اونٹوں کی سجاوٹ، ساربانوں کی وضع قطع، مشک و عنبر اور دوسرے تجارتی سامان، جن کی تجارت کے لیے بلوچستان کے تاجر سندھ میں آیا کرتے تھے۔

نوری جام تماچی کی داستان میں ایک طرف حکمراں طبقے کے محلوں کی جاہ و حشمت کا عکس اور دوسری طرف غریب ماہی گیروں کی پسماندہ اور غلیظ زندگی کی تصویریں۔

عمر ماروی کے قصے میں برسر اقتدار طبقے کی تعیش پسندی اور خانہ بدوش چرواہوں کی رواں دواں زندگی!

ہمارے ہاں نظیر اکبر آبادی کو سب سے بڑا عوامی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ کیا کوئی اس اعتبار سے نظیر اکبر آبادی اور شاہ کے کلام کا موازنہ کرے گا؟ — بس فرق ہے تو اتنا کہ شاہ سندھی زبان کے شاعر تھے اور نظیر اُردو کے، اُردو جو سندھی کے مقابلے میں زیادہ پڑھی اور بولی جاتی ہے۔

۱۳
قدم

آئیے اب کچھ شاہ صاحب کو ذاتی حیثیت میں بھی جاننے کی کوشش کریں۔

○ شاہ لطیف کے جدِ امجد شاہ کریم، خانِ خاناں کے دور کے ایک بہت بڑے صوفی شاعر تھے۔ جن سے خانِ خاناں کو بڑی محبت تھی۔ بڑی عقیدت تھی۔

سلسلہ کچھ یوں تھا :۔

○ شاہ کریم — جمال شاہ — عبدالقدوس شاہ — حبیب شاہ — شاہ لطیف اور جمال شاہ۔

○ شاہ لطیف کلموڑوں کے عہد میں پیدا ہوئے اور اسی زمانے میں ان کی شاعری پروان چڑھی۔ پہلے نور محمد کلہوڑہ نے جو یار محمد کلہوڑہ کے بعد سندھ کا مطلق العنان حاکم تھا۔ شاہ کو اپنا حریف سمجھا اور سازشوں سے ہلاک کرانے کی کوشش کی۔ لیکن آخر کار اسے شاہ لطیف سے اتنی عقیدت ہوگئی کہ اس نے مرتے وقت اپنے جانشین غلام محمد کلہوڑہ کو شاہ لطیف کے مزار پر ایک دیدہ زیب مقبرہ بنوانے کی وصیت کی۔

(شاہ لطیف کی پیدائش کے متعلق یوں بھی کہا جا سکتا ہے - کہ وہ اورنگ زیب کے آخری زمانے میں پیدا ہوئے - جب کہ سندھ میں کلہوڑوں کی حکومت تھی)

○ سنِ ولادت ۱۶۹۰ء

○ شاہ کے والد سید حبیب کوٹری کے قریب "ہالا" حویلی میں رہتے تھے اور موصوف کا شمار اس عہد کے مشہور و معروف بزرگوں میں ہوتا تھا۔

○ شاہ کے آباؤ اجداد کا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ اور رسولِ خداؐ تک پہنچتا ہے -

○ کہا جاتا ہے کہ شاہ کا کلام ہر سندھی کی گھٹی میں پڑا ہے - یہ درست بھی ہے - شاید ہی کوئی سندھی ایسا ہو - جسے شاہ کے کچھ اشعار یاد نہ ہوں -

○ شاہ کے کلام کا انگریزی، جرمنی، فارسی اور ہندی میں ترجمہ کیا گیا - جس طرح مثنوی مولانا روم کو "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" کہا جاتا ہے - اسی طرح شاہ کے عقیدت مند اُن کے رسالے کو "ہست قرآں در زبانِ سندھوی" کہتے ہیں -

○ شاہ نے اپنے کلام میں مولانا رومی کو اتنی ہی عقیدت سے پیش کیا ہے - جتنی عقیدت سے علامہ اقبال نے - کہتے ہیں کہ شاہ قرآن کریم کا

ایک نسخہ اور مثنوی رومی کی ایک جلد ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

○ شاہ کے عقیدت مند صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ لاکھوں ہندو بھی تھے۔ سندھی ہندوؤں نے شاہ کے کلام پر بہت کام کیا ہے۔ ڈاکٹر گربخشانی اور دیوان وطن مل نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

○ انگریزی میں شاہ کے کلام کا منظوم ترجمہ معہ تین سو صفحات کے ڈاکٹر سورلے نے پیش کیا۔ کتاب کا نام ہے :

Shah Latif of Bhit

○ شاہ لطیف کا زمانہ سندھ میں تصوف کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ خاص طور پر ٹھٹھہ میں سینکڑوں ہی عالم، فاضل، صوفی، قلندر اور مجذوب موجود تھے۔ جن کا ذکر سندھ کی مشہور تاریخ "تحفۃ الکرام" میں موجود ہے۔ شاہ عنایت شہید، مخدوم معین ٹھٹوی، خواجہ محمد زمان، خواجہ لواری، مخدوم محمدی، مخدوم صابر دلھاری، مخدوم محمد ہاشم، مخدوم عبدالرحیم گروھڑی جیسے باکمال بزرگوں سے شاہ صاحب کے دوستانہ تعلقات تھے۔ یہ سب بزرگ شاہ ولی اللہ کی تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔

○ شاہ لطیف قادری سلسلے کے بزرگ تھے۔ قادریہ مسلک میں اگرچہ محفل سماع ممنوع ہے۔ لیکن موصوف کو موسیقی کے ساتھ کچھ ایسا روحانی لگاؤ تھا کہ برصغیر کے مشہور و معروف موسیقار بھٹ شاہ

آنے رہنے اور ہر روز محفلِ سماع کا انعقاد ہوتا۔

شاہ لطیف سے بہت سی کرامات بھی منسوب کی جاتی ہیں۔ مثلاً :۔

○ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ٹھٹھہ کے کچھ بزرگوں نے چاہا کہ شاہ صاحب کو محفلِ سماع سے روکا جائے۔ اس غرض سے انھوں نے بھٹ شاہ جاکر شاہ لطیف کو گھیر لیا۔ شاہ صاحب نے احتراماً پہلے ہی اپنے فقیروں اور مریدوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ طنبورے، اِکتارے اور سرود وغیرہ کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دو۔ تاکہ وہ ان سازوں کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ فریقین میں مختلف قسم کے سوال و جواب ہوتے رہے۔ آخر میں شاہ صاحب نے کہا کہ ــــ "میرے دل میں عشقِ حقیقی کا سبزہ زار ہے۔ جس کی سرسبزی و شادابی کے لیے موسیقی بارانِ رحمت کا کام کرتی ہے" ــــ شاہ صاحب کا یہ کہنا تھا کہ اس کوٹھڑی سے جہاں اِکتارے، طنبورے اور سرود وغیرہ کو بند کر دیا گیا تھا۔ سازوں کے بجنے کی آواز آنے لگی اور آنے والے اس بات پر اتنے حیرت زدہ ہوئے کہ پھر بغیر کچھ کہے سُنے واپس لوٹ گئے۔

○ اس دَور کے سندھی فرمانروا میاں نور محمد کلہوڑہ نے شاہ کو اپنے لیے ایک خطرہ سمجھتے ہوئے کئی بار ہلاک کرانے کی کوشش کی۔ لیکن آپ پر اُس معجون کا کوئی مہلک اثر نہ ہوا جو زہر ملا کر دی گئی ــــ اور نہ ہی

شاہ کے

عقیدت مند

وہ شریر گھوڑی آپ کو نقصان پہنچا سکی - جس پر زبردستی اس لیے سوار کرا کے چھوڑ دیا گیا تھا کہ اس سے گر کر انتہائی نحیف و نزار جسم بُری طرح زخمی ہو جائے گا ___ آخر کار نور محمد کلہوڑہ آپ کے مریدوں میں شامل ہو گئے اور اپنے خاندان کے لوگوں کو وصیت کی کہ وہ سب شاہ صاحب کے عقیدتمندوں میں شامل ہو جائیں -

○ شاہ کے والد بزرگوار (یعنی شاہ حبیب) کے مریدوں میں وہ مغل بھی تھے - جن کا اس زمانے میں سندھ پر راج تھا - مریدوں میں سے ایک مرید مرزا مغل بیگ کی نوجوان بیٹی بیمار ہوئی - حسب معمول شاہ حبیب کے پاس ایک ملازم بھیجا کہ تشریف لائیں اور جھاڑ پھونک سے بیمار بیٹی کو اچھا کر دیں - اتفاق سے شاہ حبیب کی طبیعت کچھ ناساز تھی - اس لیے انھوں نے اپنے نوعمر بیٹے یعنی شاہ لطیف کو بھیج دیا - شاہ لطیف جب مرزا مغل بیگ کی شاندار حویلی کے زنانخانے میں پہنچے اور ان کے ہاتھ میں جب ایک حسین و جمیل دوشیزہ کی کلائی آئی تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ "جس کا ہاتھ سید کے ہاتھ میں آ جائے - اس کے لیے پھر کوئی دکھ درد کیسا!"

عام روایت ہے کہ یہ بات سن کر مرزا مغل بیگ بدظن ہوا اور اس نے انتقاماً شاہ حبیب کو کوٹری چھوڑنے پر مجبور کیا - اُدھر شاہ پر بھی اِس واقعے کا بڑا گہرا اثر ہوا - مدتِ دراز تک وہ بھوک پیاس سے

نہ جانے کہاں کہاں خشک صحراؤں کی خاک چھانتے رہے اور جب لوٹ کر اپنے گھر آئے تو معلوم ہوا کہ مرزا مغل بیگ کے خاندان کے تمام افراد ایک جنگ میں ہلاک ہو چکے ہیں ۔ صرف کچھ عورتیں اور وہ دوشیزہ باقی ہے ۔جس کی کلائی نے شاہ کو یہ دن دکھائے تھے ۔ ان صاحبزادی کا نام سیّدہ تھا ۔آخر انھیں سے شاہ کی شادی ہوئی ۔ لیکن اُس وقت جب کہ شاہ روحانیت کے نشے میں اتنے چُور ہو چکے تھے کہ دنیا داری سے انھیں کوئی سروکار نہ رہا تھا ۔

○ کہتے ہیں کہ اپنی وفات سے اکّیس دن پہلے شاہ نے مکمّل گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور کھانے پینے سے بھی قطعی طور پر بے نیاز ہو گئے تھے ۔ایک دن غسل سے فارغ ہو کر کفنی اوڑھی ، عقیدتمندوں اور مریدوں کے جھُرمٹ میں آئے ۔محفل کے انعقاد کا اشارہ کیا اور خود مراقبہ فرمانے کے لیے اپنے حجرے میں چلے گئے ۔مسلسل تین دن تک محفلِ سماع جاری رہی ۔تیسرے دن جب چند عقیدت مند حجرے میں گئے تو دیکھا کہ روحِ لطیف قفسِ عنصری سے نہ جانے کب پرواز کر چکی تھی ۔

زد نعرہ در فراق دگر کہ دسینہ چاک

شد محو در مراقبہ جسمِ لطیفِ پاک

۵ ۲ ھ ۱ ۱

یہ قطعۂ تاریخ مقبرے کے صدر دروازے پر کندہ ہے ۔

۱۴
قدم

اب کچھ شاہ لطیف کے کلام کے بارے میں :۔

شاہ کے کلام کی مقبولیت صرف اس لیے نہیں ہے کہ وہ ایک قادر الکلام عوامی شاعر ہے ۔ بلکہ ان کی مقبولیت کا ایک اہم راز یہ بھی ہے کہ انھیں روحانی طور پر وادیٔ مہران کے مشہور و معروف اولیائے کرام میں شمار کیا جاتا ہے ۔

شاہ کی شاعری کا لہجہ، مقامی رنگ آمیزی سے بھرپور ہے ۔ یہ ان کی تعمق نظری اور ان کے بھرپور مشاہدے کا کمال تھا کہ انھوں نے سندھ کے ریگزاروں پر بکھرے ہوئے موتیوں کی نشاندہی کی اور ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اپنے موضوعات کے لیے چُنا یا شاعرانہ علامات کے طور پر برتا۔

حالی اور اقبال یا اُردو کے دوسرے بڑے شعرا کے یہاں جو لب و لہجہ یا جو شاعرانہ تفکّر پایا جاتا ہے ۔ شاہ کی عوامیّت اس سے قطعی مختلف ہے ۔ مگر عرس کے موقعہ پر کچھ ایسے مضمون پڑھے گئے تھے ۔ جن میں شاہ کو" ہر اعتبار سے" اردو اور فارسی کے دیگر تمام شعرا سے

بڑا شاعر کہا گیا تھا۔ وہ لوگ عقیدت میں سب کچھ کہہ رہے تھے۔ اس لیے کہ سندھ کے پڑھے لکھے لوگ بھی شاہ کے کلام کو سننا عبادت میں شامل سمجھتے ہیں۔ غرض دنیائے اسلام میں جو روحانی مرتبہ شاعری اور تصوف کی بنا پر رومی کا ہے۔ سندھی عوام کے لیے وہی درجہ شاہ لطیف کا ہے۔

شاہ کے اشعار کا انتخاب ٹیڑھی کھیر ہے۔ اس لیے کہ شاہ کا وہ کلام جو سندھی عوام کو بے حد پسند ہے یا مرغوب ہے اور جسے وہ بار بار سنتے ہیں۔ اُس کا منظوم ترجمہ کیا بھی جائے تو اس میں وہ تاثر اور وہ نشتریت باقی نہیں رہتی۔

(بھلا ہو محبّی آفاق صدیقی کا انھوں نے اِس سلسلے میں میری رہبری کی۔ منظوم ترجمہ بھی مرحمت فرمایا اور جہاں تک واقعات کی صحت اور اُن کی فراہمی کا تعلّق تھا۔ اس میں بھی میرا پورا ساتھ دیا۔ ورنہ اس معاملے میں مَیں تو بالکل ٹھوٹ تھا۔)

منظوم ترجمہ پیشِ خدمت ہے :۔

سُر کلیان

فقط سر دے کے کب ہوتا ہے سودا — نہ سمجھو اتنا ارزاں عاشقی کو

یہ نعمت اے ہجومِ سر فروشاں — مقدّر ہی سے ملتی ہے کسی کو

سُر ایمن

شباہت زرد پھولوں کی طرح ہے   دہکتی آگ پر منڈلا رہے ہیں
صلائے عام ہے یہ شمع کی لَو   پتنگے راستہ دکھلا رہے ہیں

سُر کھمبات

نہیں اے چاند تُو اس کے برابر   کہاں تُو اور کہاں محبُوب میرا
دوامِ حسن اس کا رُوئے روشن   رہینِ منتِ شب نور تیرا

آج پھر چودھویں کا چاند اُبھرا   منتظر ہوں کسی کے آنے کی
دل مسرت سے لہلہاتا ہے   کوئی پروا نہیں زمانے کی

سُر ماروی

خوب ہیں میرے دیس کے دہقاں   کتنی نُدرت ہے ان کے جینے میں
ٹوکرا سر پہ دھول پیروں میں   جسم بھیگا ہوا پسینے میں

وہ سیہ چوڑیاں کلائی پر   ان کا ہر نقش کتنا پیارا ہے

سیم و زر کا بھی مجھے نہ دے لالچ — یہ سہارا کوئی سہارا ہے
بھول جاؤں وہ جھونپڑے کیسے — میں نے بچپن جہاں گزارا ہے

سرسری

نگاہوں سے عیاں کربِ مسلسل — لبوں پر نالہ ہائے جانستاں ہیں
سرِ منزل کوئی دم توڑتا ہے — محبت کے انوکھے امتحاں ہیں

مرے محبوب اک جامِ محبت — مجھے خود اپنے ہاتھوں سے پلا دے
قسم ہے تجھ کو اس تشنہ لبی کی — سراپا نشۂ الفت بنا دے
نہ ہو سیری کبھی وارفتگی سے — بجھاؤں تشنگی کو تشنگی سے

کچھ اُن اُدنوں نے میرا دل دکھایا — کچھ ان کے سائبانوں نے ستایا
کہوں کیا دیوروں کی دشمنی کو — جنھوں نے مجھ سے پنچھوں کو چھڑایا
گیا سورج نے خود چھپ کر اندھیرا — صبا نے نقشِ پا اس کا مٹایا
قمر بھی ہو گیا روپوش آخر — پہاڑوں نے بھی میرا غم بڑھایا
ہوا دشمن مرا سارا زمانہ — مصیبت میں نہ کوئی کام آیا

سُر سوھنی

گھڑا ٹوٹا تو یہ آواز آئی! نہیں دونوں میں اب کوئی جدائی
شکستِ جسمِ خاکی سے ہے پیدا رباب رُوح کی نغمہ سرائی
وصالِ یار کی راحت پہ قرباں طریقِ زہد و رسمِ پارسائی

سُر سارنگ

کوکتی ہے شمال میں کوئل ہل کسانوں نے کر لیے تیار
گلہ بانوں پہ کیف طاری ہے دیکھ کر یہ فضائے خوش آثار
ابر باراں کے پیرہن میں آج کتنا پُرکیف ہے جمالِ یار

بادباں صاف، قیمتی چپّو رسیاں بھی نئی میسّر ہیں
پھر بھی یہ ناؤ اور یہ مانجھی اے خدا تیرے آسرے پر ہیں

بڑا خونیں سمندر سامنے ہے کہیں ٹھنڈی ہوا میں سو نہ جانا
تلاطم خیز ہے موجوں کی یورش سنبھل کرنا ذرا آگے کو بڑھانا

سُرساموندی

یہ حالت ہے مرے بے چین دل کی ۔۔۔ کوئی بھٹکی ہوئی کشتی ہو جیسے
خبر کیا تھی کہ ان سے پیار کر کے ۔۔۔ مجھے سہنے پڑیں گے رنج ایسے
بھُلا بیٹھے ہیں مجھ کو میرے ساجن ۔۔۔ سکھی! میں اپنا جی بہلاؤں کیسے

۱۵
قدم

میں نے گزشتہ صفحات میں آپ کو بتایا تھا کہ گاڑی حیدر آباد کے اسٹیشن پر کھڑی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ گاڑی کچھ زیادہ ہی دیر کھڑی رہی آپ کو زحمت تو ہوئی۔ مگر میں نے کھڑے کھڑے جو کچھ عرض کیا ہے۔ وہ میرے نزدیک ضروری تھا۔

لیجیے پانچوں سوار کراچی چلے۔

پہلا سوار شوکت صدیقی، دوسرا صہبا لکھنوی، تیسرا ریاض انور، چوتھا پروفیسر بذل الرشید اور پانچواں یہ خاکسار!

سامان گاڑی میں رکھوانے کے بعد، یہ سوچا کہ ڈائننگ کار میں چل کر چائے پی جائے۔ بذل الرشید نے کہا۔ "آپ لوگ جائیں۔ میں

یہیں بیٹھوں گا۔"

بذل الرشید، ہمارے بنگالی بھائی! صرف پھل کھاتے ہیں اور کچھ نہیں کھاتے۔ کھانا بھی برائے نام کھاتے ہیں۔ ہم "ڈائننگ کار" کی طرف بھاگے۔ انھوں نے پھلوں والی ٹوکری کی طرف دیکھا۔

چائے سامنے آئی۔ چائے دانی میں تھوڑی سی شکر ڈال کر جب شوکت صدیقی نے چمچہ گھمایا تو ساتھ ہی زبان کو بھی چلا دیا ــــ "صہبا نے بلا وجہ جوش نمبر چھاپ دیا۔ بھلا وہ کون سے بڑے شاعر ہیں۔"

اس پر میں نے کہا۔ "جی!"

"ہاں میں کہہ رہا ہوں، جوش کونسے بڑے شاعر ہیں۔"

میں نے قدرے بھنّا کے کہا۔ "یہ تو آپ کی زیادتی ہے۔ جوش بڑے شاعر نہیں ہیں تو پھر بڑا شاعر کیسا ہوتا ہے؟ کیا بڑے شاعر کے سر پر کلغی ہوتی ہے یا" ــــ

صہبا لکھنوی، شوکت صدیقی کے جواب سے پہلے ہی بھبھک پڑے مجھے بھی پوری بات نہ کہنے دی ــــ "شوکت تم بھی بعض اوقات بڑی احمقانہ باتیں کرتے ہو۔ جتنا جوش نے کہا ہے۔ اتنا کسی اور شاعر نے نہیں کہا۔ پھر انھوں نے اتنے موضوعات پر کہا ہے کہ کسی اور نے نہیں کہا۔"

شوکت صدیقی نے ڈانٹ دیا۔ "ابے چپ رہ، خواہ مخواہ نہ

چلایا کرے۔"

ریاض انور نے خوشگوار تبدیلی پیدا کرنی چاہی۔ "میری بیوی کہتی ہے۔ سب سے بڑا افسانہ "تیسرا آدمی" سب سے بڑا ناول "میرے بھی صنم خانے" اور سب سے بڑی نظم "تاریک راہوں میں مارے گئے"۔ باقی سب بکواس!"

میں نے کہا۔ "آپ کی بیگم کا احترام واجب لیکن ان کا فیصلہ احترام کے قابل نہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے ان دو تین چیزوں کے علاوہ باقی سب کچھ کو بکواس قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ جن تخلیقات کا نام آپ کی بیگم نے لیا ہے۔ انھیں بھی ان ادیبوں کی سب سے بہتر تخلیق قرار نہیں دیا جا سکتا۔"

شوکت صدیقی نے جھجو ہنتے ہوئے فیصلہ سنا دیا۔ "شاعر تو بس فیض ہے۔"

صہبا لکھنوی نے تلملا کے کہا۔ "کُل اتّا سا تو کلام ہے" (یہ بات اُن دنوں کی ہے جب صہبا صاحب کا ارادہ فیض نمبر نکالنے کا نہیں تھا)

میں نے کہا۔ "کلام کے کم یا زیادہ ہونے ہی پر فیصلے ٹھہرے تو کئی تیسرے درجے کے شاعروں کو بڑا شاعر ماننا پڑے گا۔ لہٰذا یہ پیمانہ غلط ہے۔ البتّہ ایک بات سوچنے کی ہے کہ فیض کے الفاظ، ترکیبوں اور موضوعات تک میں یکسانیت ہے۔ بعض اوقات ان کی بالکل نئی چیز کو

بھی پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ کہیں پہلے پڑھ چکے ہیں ۔۔۔ ویسے اس بات کو یوں بھی سوچا جا سکتا ہے کہ یہ ان کے کلام کی انفرادیت ہے کہ لفظ لفظ بولتا ہے کہ میں فیض کا ہوں۔"

شوکت صدیقی نے راکھ کو جھاڑتے ہوئے کہا۔" ہاں یہی بات ہے ۔ دوسرے فیض سوچ سمجھ کر کہتے ہیں ۔جوش کی طرح نہیں ہیں کہ الفاظ ہی الفاظ سے کھیل رہے ہوں ۔

ریاض انور نے دوٹوک فیصلہ دیا۔"فیض جوش سے بڑا شاعر ہے۔"

میں نے مؤدبانہ گزارش کی۔"ہمیں ان میں مقابلہ کرنا ہی نہیں چاہیے۔ دونوں کے کہنے کا انداز الگ ہے ۔سوچنے کا انداز مختلف ہے ۔ ایک کلاسیکل شاعری کا نمائندہ ہے ۔ دوسرا دلوں کی دھڑکنوں کا ترجمان !"

صہبا لکھنوی دوٹوک رائے دینے میں کیوں پیچھے رہتے ۔"میں تو جوش کو فیض سے بڑا شاعر مانتا ہوں۔"

شوکت صدیقی نے صہبا لکھنوی کی کمزوری پکڑی ۔" اس لیے کہ تو نے جوش نمبر چھاپا ہے ۔"

ریاض انور نے پھر ٹیپ کا مصرع دہرایا ۔"میری بیوی کہتی ہے اُردو کی سب سے بڑی نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے ۔"

میں صہبا، شوکت اور ریاض ـــــ ہم سب جوش اور فیض کی شاعری پر گفتگو کر رہے تھے۔ فیصلوں پر فیصلے دیے جا رہے تھے۔ مثلاً ـــــ "جوش کیا کہتا ہے" "فیض کا اتنا سا کلام ہے" "الفاظ، ترکیبوں اور موضوعات میں یکسانیت ہے" وغیرہ وغیرہ۔

میں نے آنکھیں بند کر کے تھوڑی دیر کے لیے سوچا کہ ہم لوگ بھی کتنے بے رحم ہوتے ہیں کہ ایک منٹ میں، بڑے بڑوں کی ریاضت کو بھی چٹکیوں میں اڑا دیتے ہیں۔ ٹھسک ہو تو ایسی!

ابھی گفتگو اور میری سوچیں یہیں تک پہنچی تھیں کہ ڈائننگ کار سے اپنے ڈبے میں آ گئے۔ تھوڑی دیر سب خاموش رہے۔ جیسے اپنی زیادتیوں پر شرمسار ہوں۔

ایک دم شوکت صدیقی کو گلدڑیا د آ گئی۔ "یار گلدڑ نے بڑا کام کیا ہے۔ دیکھو یہی کیا کم ہے کہ اس کے ذریعہ ہم سب اکھٹے سفر کر رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے لوگ بھی مل بیٹھتے ہیں۔ یوں میل ملاپ سے فائدے پہنچتے ہیں"

ریاض انور نے نکتہ نکالا۔ "گلڈ تو ہے۔ مگر ادب ختم ہو گیا"

شوکت صدیقی نے ایک اور نکتہ نکالا۔ "حکومت کوئی پاگل تھوڑی ہے۔ جو آپ کو اتنی بڑی بڑی رقمیں دیتی ہے۔ وہ یہی چاہتی ہے۔ جو ہو رہا ہے۔

قلم مڑے رہیں۔ سفر جاری رہیں۔ اب تو ہماری کالونی بھی بن رہی ہے۔"

صہبا کیسے چپ رہتا۔ "ہاں جیل کے پاس کالونی بن رہی ہے۔ اگر وہ بن گئی تو پھر لطف آئے گا۔ سارے کے سارے ہی گھر خالی رہا کریں گے۔ اگر کوئی کسی ادیب کو ڈھونڈھنا چاہے گا تو وہ ملے گا کہاں۔ معلوم ہوگا کہ فلاں شاعر، فلاں شاعر کو اپنی غزل سنانے گیا ہے اور فلاں افسانہ نگار، فلاں افسانہ نگار کو افسانہ سنانے نکلا ہے اور فلاں نقاد، فلاں نقاد کو اپنا مضمون سنانے گیا ہے۔ غرض بیویاں گھر میں ہوں گی۔ میاں گھر سے باہر!

چونکہ ڈبے میں اور مسافر بھی تھے۔ اس لیے ہم مصلحتاً بھی کچھ دیر خاموش رہے اور اسی مصلحت میں کراچی کا اسٹیشن آ گیا۔

ریاض انور کو جمیل الدین عالی سے ملنا تھا۔ وہ شوکت صدیقی کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھے۔ مجھ سے صہبا لکھنوی نے پوچھا "آپ کہاں ٹھہریں گے؟"

"اپنا یار تو پیرس گیا ہوا ہے۔ گھر میں اس کے بیوی بچے تو ہیں مگر میرا دل نہ لگے گا۔ اس لیے میں تو کسی ہوٹل میں ٹھہروں گا۔"

صہبا لکھنوی سراپا خلوص بن گئے۔ "واہ! ہم مر گئے ہیں کیا؟ آپ میرے ہاں چلیں۔"

"نہیں بابا نہیں۔ میں تو کسی ہوٹل ہی میں ٹھہروں گا۔ تاکہ آزادی کے ساتھ اُٹھ بیٹھ سکوں۔ ورنہ دوست تو اور بھی ہیں۔"

صہبا نے ایک حل بتایا۔ "اچھا یوں کرو۔ ابھی تو میرے ساتھ چلو۔ منہ ہاتھ دھوکر، کھانا کھا کے، تھوڑا سا آرام کرکے کہیں اور چلے جانا۔"

"جتنی باتیں آپ نے کرنے کے لیے کہا ہے۔ اس میں تو رات ہو جائے گی۔ لہٰذا مجھے بخش دیا جائے۔"

میں نے بات بھی پوری نہ کی تھی کہ کیا دیکھتا ہوں۔ صہبا میرا سامان بھی اُسی ٹیکسی میں رکھوا رہے ہیں، جس میں اپنا سامان رکھوا چکے تھے۔

میں نے ملتجیانہ نظروں سے شوکت صدیقی کو دیکھ کر کہا۔ "یار یہ تو باتیں کر کرکے مار ڈالے گا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔"

"پھر کیا کروں؟"

"اپنا بیمہ کرا کے اس کے ساتھ جانا۔"

چنانچہ یہ خاکسار، بیمہ کرائے بغیر صہبا کے ساتھ ہو لیا۔ اپنے ہاں لے جا کر انھوں نے وہ خلوص چھڑکا، وہ خلوص چھڑکا کہ مجھے ان کی باتوں میں خلوص تیرتا ہوا نظر آیا۔ چنانچہ چپکے سے ڈیڑھ دن ان کے ہاں پڑا رہا۔

پہلا دن تو سو کے گزار دیا۔ یا گھر خط لکھا کہ میں کراچی آج پہنچا ہوں اور ایک خلوص کار کے ہاں ٹھہرا ہوں۔

۱۶
قدم

دوسرے دن دوستوں کو ٹیلیفون کیے۔ سبھی نے پکڑنے کے لیے دعوت کی چھوٹ دی۔ اکیلی جان، ایک وقت میں ایک ہی تو دعوت کھا سکتا تھا۔ بہرحال جس نے پہلے کہا۔ اس کے ہاں پہلے جانا طے ہو گیا ــ ایک مسافر، سب کا مہمان، یہی سوچ لیا۔

دس بجے کا بیٹھا۔ بارہ بجے تک ٹیلیفون کرتا رہا۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے نمبر نکالنا، کوئی آسان تھوڑی ہوتا ہے۔ اتنے میں بارہ بج گئے۔ بارہ بجے انصار ناصری (ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان) نے بلایا تھا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ میٹنگ ہو رہی ہے۔ اپنے نام کی چٹ بھجوا دی۔

پانچ منٹ کے بعد انصار ناصری صاحب یہ کہتے ہوئے گلے ملے۔ "بھائی! مجھے معاف کر دینا۔ ایک میٹنگ تھی۔ جس کا آپ سے بات کرتے وقت خیال نہ رہا۔ بہرحال میں اٹھ کے آ گیا ہوں۔ کہیے کیا حال احوال ہیں؟ کب آئے؟ کہاں ٹھہرے" وغیرہ وغیرہ!

انصار ناصری صاحب، ایک بڑے علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ بڑی محبّت والے، کسی بات کا ذرا سا بھی غرور نہیں۔ ممکن ہے یہ

انصار ناصری :

یہ ریڈیو کے اتنے بڑے عہدے پر ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا شریف آدمی یہاں تک کیسے پہنچا۔ یہ میر ناصر علی کے پوتے ہیں۔ وہی میر ناصر علی جو نثر میں شعر کہا کرتے تھے۔ انھوں نے تحریری طور پہ تو اُن کا رنگ نہیں اپنایا۔ مگر تحریر کی ساری لطافتیں اپنی گفتگو میں بسالی ہیں۔ اپنے اخلاق میں رچالی ہیں۔ اور یہ کام لکھنے سے زیادہ مشکل ہے۔ اس لیے کہ لکھنا قدرت کا عطیہ ہے اور آدمی بننا خود ساختہ کمال!

اوروں کے لیے صاحب بہادر ہوں۔ مگر میرے ساتھ یہ برابر کے دوستوں والا رویّہ رکھتے ہیں۔ تہذیب اور شائستگی جیسے ان پر ختم ہو۔

میں نے انھیں دو تین خط لکھے تھے۔ ان کی طرف سے جواب نہیں ملا تھا۔ پہلے تو یہ معذرت کرتے رہے کہ آپ کے خط میری عدم موجودگی میں آئے۔ پہلے میں ڈھاکہ گیا ہوا تھا۔ پھر راولپنڈی جانا پڑا۔ دفتر آیا تو آپ کے خط کا جواب دیا تھا۔ غالباً ملا ہوگا۔

"جی مجھے تو نہیں ملا۔ میں ۵ تاریخ کا نکلا ہوا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں نے خط ۶ تاریخ کو لکھا تھا اور میں نے آپ کے خط کی تعمیل میں ریجنل ڈائرکٹر حمید نسیم سے کہہ دیا تھا کہ وہ شوکت تھانوی کے سلسلے میں، جو تعزیتی پروگرام نشر ہوا تھا۔ اس کی نقلیں آپ کو بھجوا دیں۔ اوّل تو انھوں نے بھجوا دی ہوں گی۔ ورنہ کل آپ خود جاکر لے لیں۔ میں اُنھیں ٹیلیفون کیے دیتا ہوں۔"

"اور سنائیے کیا ہو رہا ہے؟"

"میں نے کیا کرنا ہے۔ حسبِ معمول گھاس کھود رہا ہوں۔"

"ارے صاحب! آپ کے کارناموں کے تو جھنڈے گڑے ہیں۔"

اپنی تعریف سے خوشی کی بجائے، شرم نما قسم کی چیز میرے چہرے پر ہویدا ہو جاتی ہے اور چاہتا ہوں کہ بات کا رُخ جلد پلٹے۔ چنانچہ کارناموں

کے جھنڈے گرٹنے کے جواب میں' میں نے عرض کیا۔"یہ بتائیے حفیظ صاحب۔
(ہوشیارپوری) کہاں ملیں گے؟"

"وہ ابھی تک میٹنگ میں ہیں۔جاتے ہوئے یہاں سے گزریں گے۔"

تھوڑی دیر بعد حفیظ صاحب بھی آگئے۔"آخاہ! طفیل! کب آئے؟"

"کل وارِدِ شہر ہوا ہوں۔"

حفیظ صاحب نے انصار ناصری کی طرف دیکھ کر پوچھا۔"میں طفیل کو اغوا کر سکتا ہوں؟"

"کر لیجیے۔اغوا کرنے کی چیز تو ہیں۔"

اب میں حفیظ صاحب کے ساتھ ان کے کمرے میں آگیا۔کہنے لگے۔
"آپ پچھلی مرتبہ جب کراچی آئے تھے تو مجھے کیوں مل کر نہ گئے؟ مجھے راشدی صاحب نے بتایا تھا کہ طفیل آپ سے ناراض تھا۔اس لیے نہیں ملا تھا۔"

"ہماری ناراضگی کیا ہے۔صرف دوستانہ چہلیں ہیں۔مگر اس بار تو خود ہی حاضری دینا۔انصار ناصری صاحب سے آپ کا پوچھ ہی رہا تھا کہ آپ آگئے۔"

"ٹھیک ہے۔ٹھیک ہے۔یہ بتاؤ کیا پیو گے؟"

"ابھی ابھی انصار ناصری صاحب نے چائے پلائی ہے۔اس وقت مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

حفیظ ہوشیارپوری :

بڑی نفیس غزل کہنے والے حفیظ، نہ جانے اپنا دل کس "شعر" پر اٹکائے بیٹھے ہیں کہ دنیا جہان کو بھولے جا رہے ہیں ۔ غزل کہنے والا دوسروں سے زیادہ حساس ہوتا ہے ۔ اس لیے خیال یہ ہے کہ وہ اوروں سے زیادہ پگھلے گا ۔ مگر یہ اس حد تک چپ رہنے لگے ہیں کہ جیسے کوئی پتھر ہوں ۔ پاس جا کے بیٹھیے تو محسوس ہو گا کہ حرارت باقی ہے ۔ بس ذرا جھجکی کی زد میں آئے ہوئے ہیں ۔ چونکیں گے تو والہانہ انداز میں اُٹھ کے ضرور گلے ملیں گے ۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کراچی میں تو ہر گھڑی کچھ نہ کچھ چلتا رہتا ہے۔ یہ کوئی لاہور تھوڑی ہے کہ سوچ سوچ کر ہر کام کیا جائے۔ یہاں تو ہر کام بغیر سوچے سمجھے ہوتا ہے۔"

"یہ بات ہے تو پھر جو جی چاہے منگوا لیجیے۔"

تھوڑی دیر کے بعد، میں نے اجازت چاہی۔ مگر حفیظ صاحب کا اصرار تھا کہ کھانا بھی کھا کے جاؤں۔ میں نے کہا۔ "کھانا تو میں وہیں جا کے کھاؤں گا۔ جہاں ٹھہرا ہوں۔ اس لیے کہ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"کہاں ٹھہرے ہیں؟"

"صہبا لکھنوی کے ہاں!"

"ارے صہبا کے پاس؟"

"جی ہاں وہ میرے ساتھ ہی حیدر آباد سے آئے تھے۔ انھوں نے زبردستی کی۔ انکار کی ہمت نہ ہوئی۔ مگر اب وہ بڑی محبت سے پیش آ رہے ہیں۔ حالانکہ اس سے پہلے کچھ تنا تنی سی تھی۔"

"میں ابھی صہبا صاحب کو ٹیلیفون کرتا ہوں کہ طفیل میرے ساتھ کھانا کھائیں گے۔"

"کر دیجیے۔"

حفیظ صاحب نے ٹیلیفون کیا۔ ریسیور رکھ کر مجھ سے کہا۔ "بھئی

نہیں مانتے۔ کہتے ہیں جب تک طفیل صاحب نہ آئیں گے۔ میں کھانا نہ کھاؤں گا
—ہاں صاحب محبت ہو تو ایسی۔"

بہرحال حفیظ صاحب سے رخصت ہو کر صہبا صاحب کے ہاں پہنچا۔
صہبا منتظر ہی تھے۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گیا۔ آنکھ
لگ گئی۔

۱۷
قدم

اہلِ کراچی سے خراج تو وصول کر ہی رہا تھا۔ اس لیے مولانا
ماہر القادری کے ہاں بھی پہنچا۔ ماہر صاحب خود بڑے خوش خور آدمی ہیں۔
اس لیے انھوں نے مجھ اکیلے کے لیے بھی دس آدمیوں کا انتظام کیا ہوا تھا۔
چائے کے بعد پرچوں کی بات چل نکلی۔ انھوں نے مجھ سے کہا۔
"آپ نے ڈائجسٹ پرچوں کے خلاف جو مہم چلائی تھی۔ وہ بڑی مفید تھی۔
مگر چند لوگوں کی روزی متاثر ہوتی تھی۔ اس لیے بات نہ بنی۔ کیا ہوا آخر
اُس کا؟"

"بقول آپ کے معاملہ روزی کا تھا۔ اس لیے اصول وغیرہ
سب دھرے رہ گئے۔"
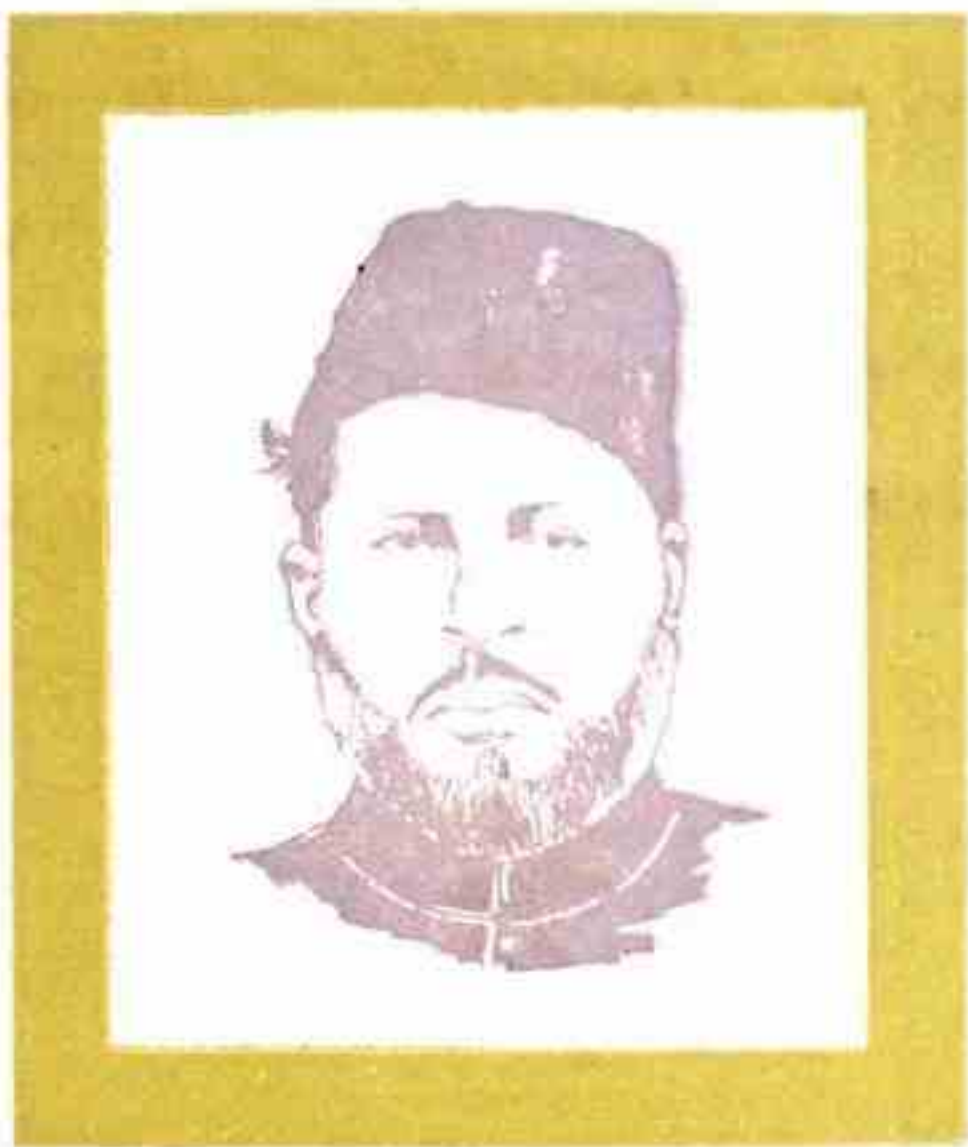
ماہر القادری :

میں ماہر صاحب کو اُس وقت سے جانتا ہوں جب
ان کے ہاں داڑھی نہ تھی۔ اب بھی ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ
چیز ایسے ہی ہے۔ اصل میں مَیں وہی ہوں جو کہ تھا۔ اس
تہمت کے باوجود یہ حد درجہ زندہ دل ہیں۔ لطیفے پہ لطیفے
کہنے والے، پھبتی پہ پھبتی کسنے اور کسوانے والے، ایک دم
خلوص کا یقین دلانے والے، پھر باتیں ایسی کرنے والے،
جیسے بڑے معصوم ہوں۔

"یار شوکت تھانوی مرگیا۔ بڑے مزے کا آدمی تھا۔"

"جی ہاں مرگئے۔ جو مرتا ہے وہ اپنی جگہ ہمیشہ کے لیے خالی چھوڑ جاتا ہے۔ اس ادبی قحط کے زمانے میں اُن کا دم بڑا غنیمت تھا۔"

"انھیں ہُوا کیا تھا۔ ایک دم مرگئے۔ یا آہستہ آہستہ؟"

ماہر صاحب بعض اوقات بڑے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔ اب اس "آہستہ آہستہ" کا بھی کوئی کیا جواب لاسکے گا ــــ میں نے مسکرا کر بات کا رُخ پلٹ دیا۔ "آپ کے مرحوم سے بڑے مراسم تھے۔ اس لیے اُن پر مضمون لکھیے۔"

"جی ہاں ضرور لکھوں گا آپ کے لیے، ایک مضمون اپنے پرچے میں لکھ چکا ہوں۔ مگر آپ کے پرچے کے لیے جو لکھوں گا۔ وہ تو خاص چیز ہوگا۔"

"مولانا! یہ خاص چیزیں دوسروں کے لیے اور عام چیزیں اپنے لیے! یہ کیا بات ہے؟"

"بس ہے۔"

اب اِس "بس ہے" کا بھی میرے پاس جواب نہ تھا۔

مولانا نے شوکت نمبر کے لیے، بعض مفید مشورے بھی دیے جنھیں میں گرہ میں باندھ کے لے آیا۔ مولانا کے خلوص پر میرا ہمیشہ ایمان رہا ہے

مسکرا مسکرا کے باتیں کرتے ہیں۔ شاید بھولے بھالے بھی ہیں۔ مذہب کا علَم اٹھائے دینی فوج کے آگے آگے چل رہے ہیں۔ بڑے یقین کے ساتھ باتیں کرتے ہیں۔ صدر سے لے کر وزیروں تک، وزیروں سے لے کر سفیروں تک سب کے ساتھ بے تکلفی کا رشتہ بتاتے ہیں۔ اگر معاملہ اس کے برعکس بھی ہو تو وہ جو میں نے ابھی کہا ہے کہ بھولے بھالے ہیں۔ وہ بات تو غلط نہ ہوئی۔

مولانا کے بارے میں میں نے یہ بھی سنا ہے کہ یہ صرف ظاہراً مولوی ہیں مگر "دلِ پاک" رکھتے ہیں۔ یعنی حسین صورتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ صرف سجدہ روا نہیں سمجھتے۔ اگر یہ بات سچّی ہو تو واقعی اس حلیے کے باوجود یہ کتنے پیارے ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے انھیں ہمیشہ جھک کر سلام کیا اور یہ سمجھ کے سلام کیا۔ ممکن ہے اسی بہانے میری بھی مغفرت ہو جائے۔

مولانا کے پاس سے اُٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ غلام حسین مصطفٰے اکو (جو گجراتی زبان کے بڑے ادیب ہیں) چھ بجے کا وقت دے رکھا تھا۔

چھ بجے کے قریب غلام حسین مصطفٰے آئے۔ ان کے ساتھ حاجی عمر محمد تھے۔ میرے یہ دونوں دوست میمن بھی ہیں۔ مومن بھی ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند، مصطفٰے صاحب سندھیا اسٹیم نیوی گیشن میں خزانچی ہیں۔ مگر حاجی عمر محمد بڑے مالدار، مگر ادب سے والہانہ محبّت رکھنے والے۔

حاجی صاحب نے آتے ہی پوچھا۔ "کیا پروگرام ہے؟"
میں نے کہا۔ "آج رات کا کھانا راشدی صاحب کے ہاں ہے۔ مگر ہے مشکوک، اس لیے کہ انھوں نے مجھے حیدرآباد میں کہا تھا کہ کل صبح مجھے ملیے گا اور رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیے گا۔ صبح میں مل نہیں سکا۔ اب میں رات کے کھانے کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ ہے کہ نہیں۔"
حاجی صاحب نے کہا۔ "کل رات ہمارے ہاں کھانا کھائیے گا۔"
"یہ مشکل ہوگا۔ کل رات شاہد احمد دہلوی کے ہاں جاؤں گا۔ انھوں نے مجھے بذریعہ خط، لاہور ہی میں مطلع کر دیا تھا کہ ایک وقت میرے ساتھ کھانا کھائیے گا۔ اُن سے انکار مشکل ہے صاحب!"
"یہ کام مجھ پہ چھوڑ دیجئے۔ میں شاہد صاحب کو راضی کر لوں گا۔"
"اگر آپ حضرات خود ہی کوئی فیصلہ کریں تو مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔"
چنانچہ اسی وقت، انھی کی موٹر پر، پہلے راشدی صاحب کے ہاں پہنچے تاکہ آج کا پروگرام معلوم ہو۔ مگر راشدی صاحب ہی نہ ملے۔ گھر تھا کہ مہمانوں سے پٹا پڑا تھا۔ اس کے بعد شاہد صاحب کے گھر کی طرف چلے۔ ہم میں سے سب نے شاہد صاحب کا گھر ایک ایک دو دو بار کا دیکھا ہوا تھا۔ مگر اس دن تینوں میں سے کسی کو نہ ملا۔ بالآخر ایک جگہ سے ٹیلیفون کیا۔ شاہد صاحب راضی ہو گئے اور کہا۔ "حاجی صاحب کے سامنے بول نہیں سکتا۔ اِس لیے

مجبوری ہے۔ شاہد صاحب سے طے کرکے پھر راشدی صاحب کے ہاں پہنچے۔ ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے کھانے پر اصرار کیا۔ مگر حاجی صاحب نے اشارے سے کہہ دیا۔ "انکار کر دو"

میں نے راشدی صاحب سے کہا۔ "آپ کے ہاں بڑے مہمان ہیں اس لیے مجھے چھٹی دیجئے۔ وہ کھانے پر اصرار کرتے رہے۔ مگر میں نے بھیڑ سے فائدہ اٹھایا اور کھسک آنے ہی میں خیریت جانی۔ یوں وہاں سے نکلے تو حاجی صاحب نے کلفٹن چلنے کے لیے کہا۔ بھلا مجھے کیا انکار ہو سکتا تھا۔ خواہ مجھے کوئی دن میں دس مرتبہ کلفٹن چلنے کے لیے کہے۔

ہمارے ساتھ غلام حسین مصطفےٰ برابر رہے۔ مگر یہ بولتے کم ہیں۔ سر سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ اس لیے یہ اس تحریر میں بھی بول نہیں رہے بلکہ سر سے کام لے رہے ہیں۔ میں کیا کروں؟ اپنی طرف سے انھیں "بولنا سکھا" سکتا ہوں۔ مگر اس کا فائدہ؟ بہرحال یہ میرے ایسے مہربان دوستوں میں ہیں۔ جن کے لیے میرے دل میں جگہ ہے۔

۱۸
قدم

نئے کلفٹن پہنچے۔ حاجی عمر محمد باوجود اس کے کہ تاجر ہیں۔ لیکن ادب کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے بات چھیڑی۔ "یہ جو آپ کی اور شاہد احمد دہلوی کی (اُردو کے بارے میں) چل رہی ہے۔ اس سے پڑھنے والوں کو بڑا فائدہ پہنچے گا۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔ بشرطیکہ جانبین معاملہ فہمی سے کام لیں اور اس مسئلے کو غلط رنگ نہ دیں۔ ورنہ اس کا فائدے کی بجائے نقصان ہوگا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اگر غلط رُخ پہ بیٹھا۔ تو خود ہار مان لوں گا۔ اس لیے کہ میرا مقصد شرارت نہیں۔ بلکہ اُردو کے ضمن میں اپنی ناچیز رائے کا اظہار ہے۔"

میرا خیال ہے کہ یہاں جس بات کا ذکر نکلا ہے۔ اُس کی وضاحت کر دوں۔

میں نے اُردو کے ضمن میں نقوش کے شمارہ ۹۷ میں "اُردو والوں" سے استفسار کیا تھا۔ جو من و عن نقل کرتا ہوں:۔

"آپ بھی دل میں کشادگی پیدا کریں۔ تاکہ کہا سنا

بُرا نہ لگے۔

اُردو بھی کیا اچھی زبان ہے۔ اُردو ہی پر کیا منحصر، ساری دنیا کی بڑی زبانیں، اپنے اندر دوسری زبانوں بلکہ مقامی بولیوں تک کے الفاظ اپنانے کی صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ وہ زبان کیا ترقی کرے گی جو اپنے اندر چھوت چھات رکھتی ہو۔

ایک زمانہ تھا کہ لکھنؤ اور دلّی کی زبان سند کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔ یہ الگ بات کہ زبان کے معاملے میں یہ دونوں فریق بھی کبھی مطمئن نہ ہوئے۔ لکھنوی کچھ کہتے رہے۔ دہلوی کچھ کہتے رہے۔ جو چیز لکھنؤ سے مؤنث چلتی تھی۔ وہ دلّی پہنچ کر مذکّر بن جاتی تھی۔

زبان کے اعتبار سے، آج لکھنؤ نہ وہ لکھنؤ ہے۔ نہ دلّی وہ دلّی ہے۔ اس لیے اُردو کے طالب علم کدھر جائیں۔ کسے اپنا امام تسلیم کریں؟ سند کس سے پائیں؟ — امیر و داغ سے؟ آزاد و سرشار سے؟ چھوڑیے صاحب! یہ لوگ اپنی عظمتوں کے باوجود اپنا وقت گزار چکے۔ اُن کے سامنے آج کا ماحول نہ تھا۔ اُن کے سامنے اُردو کو اپنے گھر سے دھکّے مار کر نہیں نکالا گیا تھا۔ اُن کے سامنے پاکستان اُردو کے لیے پناہ گاہ نہیں

بنا تھا۔

آج جب کہ اُردو کا مسکن صرف مغربی پاکستان ہے تو پھر سوچیے کہ پاکستان میں آئندہ چل کر اُردو کا ڈھانچہ کیا ہوگا۔ اس میں بسنے والے سرحدی ہیں، پنجابی ہیں، سندھی ہیں، بلوچی ہیں۔ اگر آج ہم نے اُس اُردو کو رواج دینے کی کوشش کی، جو اُردوئے معلیٰ کہلاتی تھی تو بات نہ بنے گی۔ مستقبل کی اُردو کے خط وخال کچھ اور ہی ہوں گے۔ جس میں پشتو، پنجابی، سندھی اور بلوچی کے الفاظ کو بھی جگہ دینا ہوگی۔ آج اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ "میں نے جانا ہے" — غلط ہے تو وہ کوئی دانشمندی کا ثبوت نہ دے گا۔ آج اُردو کو اہلِ پنجاب کے مزاج کا ساتھ دینا ہوگا۔ نہ صرف اہلِ پنجاب کا، بلکہ اہلِ سرحد کا، اہلِ سندھ کا اور اہلِ بلوچستان کا بھی، ان سارے خطوں کے خمیر سے جو اُردو بنے گی وہی مستقبل کی اُردو ہوگی — لہٰذا — "بادشاہو! ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میرا نعرہ اُدھ کچری اُردو کو رواج دینا نہیں ہے۔ بلکہ مؤدبانہ گزارش صرف اتنی ہے کہ اس خود رَو پودے کی نشوونما میں غیر فطری باڑیں نہ لگائی جائیں — آپ اگر کسی طرح صدی

یا نصف صدی کے بعد پھر اس دنیا میں آسکیں تو دیکھ لیجیے گا کہ
آپ کو اُردو اسی طرح غیر مانوس نظر آئے گی۔ جس طرح ہمیں دکنی
اُردو نظر آتی ہے۔ مرکز بدلنے سے زبانیں بھی بدل جایا کرتی ہیں۔
اور اس فطری امر کو خوش فہمیوں کی آغوش میں رہ کر بدلا نہ جاسکے گا۔

"اُردو جو لال قلعہ کی زبان ہے اُسے آج مغربی پاکستان
کے گلی کوچوں کی زبان بننا ہوگا۔ ورنہ ــــ ورنہ اس ڈولی کا بوجھ
ہمارے کندھے سہار نہ سکیں گے۔

آج میری باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے مَیں اُردو
جیسی پیاری اور نستعلیق زبان کے معاملے میں سوتیلی ماں کا سا
رول ادا کرنے نکلا ہوں۔ یہ تہمت تسلیم، مگر میں نہیں چاہتا کہ سگی
ماں کے بے جا چونچلوں سے اس غریب کا مستقبل ہی تباہ
ہو جائے ــــ "سگی ماں" نے جو کچھ مشرقی پاکستان میں اُردو کے
ساتھ کیا۔ وہ سب کے سامنے ہے۔

میں اُردو دشمن بن کر جی لوں گا۔ مگر یہ چاہتا ہوں۔ بصد خلوص
چاہتا ہوں کہ ــــ اُردو کی مانگ کا سیندور نہ لُٹے!

میرے اس اداریے کے جواب میں بہت کچھ سوچا گیا اور تھوڑا بہت
لکھا گیا۔ لکھنے والوں میں شاہد احمد دہلوی، ڈاکٹر گیان چند، سہیل بخاری،

ل احمد، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، اختر جمال ــــ اور (بعد میں) عصمت چغتائی نے حصّہ لیا۔

بعضوں نے یہ کہا۔ آپ ایسا سوچیں ہی نہیں۔ آپ کی تحریک سے اُردو کا حلیہ بگڑ جائے گا۔ بعضوں نے کہا۔ زبان تو عوام بناتے ہیں۔ اگر عوام نے اسی طرح سوچنا اور بولنا شروع کر دیا تو پھر اسے کوئی روک بھی نہیں سکتا۔

جو دوست میری تجویز کے خلاف تھے۔ ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یوں گرامر میں بے اصولیاں راہ پا جائیں گی۔ میری گزارش ہے کہ کیا اُردو گرامر میں اب کوئی جھول نہیں؟ میرے نزدیک تو اُردو گرامر آج بھی موم کی ناک ہے۔ جو بیشتر معاملات میں مقررہ اصولوں کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ مثلاً :۔

قواعد میں ماضی مطلق بنانے کے لیے مصدر کا 'نا' دور کرنے کے بعد اگر الف یا واؤ بچے تو یا لگاتے ہیں۔ مثلاً آنا سے آیا اور رونا سے رویا۔ ــــ اور اگر الف یا واؤ کے علاوہ اور کوئی حرف بچے تو الف لگا دیتے ہیں۔ مثلاً بھرنا سے بھرا۔

لیکن مروّج ہے :۔

ہونا سے ہوا ــــ اصولاً ہویا چاہیے

کرنا سے کیا ــــ اصولاً کرا چاہیے

جانا سے گیا ——— اصولاً جایا چاہیے

مرنا سے مرا ——— تو قاعدے کے مطابق ہے اور موا

بے قاعدہ، اور اِس بے قاعدہ ترکیب کا استعمال سارے ہی اساتذہ نے
کیا ہے ۔ جن میں انیسؔ بھی ہیں ۔

چونکہ میرا گرامر کی کتاب لکھنے کا ارادہ نہیں ۔ نہ ہی یہ بحث اس
کتاب کا بنیادی موضوع ہے ۔ اس لیے معاملے کی وضاحت اور ذرا سی
صراحت کے بعد، وہیں پہنچتا ہوں ۔ جہاں سے چلا تھا ۔ ہاں تو حاجی عمر محمد کہہ
رہے تھے کہ ایسی بحثوں سے پڑھنے والوں کو فائدہ پہنچے گا ۔

اس کے بعد مثنوی نمبر کی بات چلی ۔ خود نوشت سوانح نمبر کی بات
چلی ۔ شوکت نمبر کی بات چلی ۔ چونکہ حاجی صاحب سے، میری تھوڑی سی
بے تکلفی بھی ہے ۔ اس لیے میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا ——— پہلے
کھانے کی بات چلے گی ۔ اس کے بعد کوئی اور بات چلے ——— چنانچہ ہم
کلفٹن سے اُٹھ کر ہوٹل فاروق آ گئے ۔ جہاں کھانا بھی چلا ۔ باتیں بھی چلیں ۔

۱۹
قدم

کل جب راشدی صاحب سے ملا تھا تو انھوں نے یہ کہا تھا کہ

حمید نسیم :

یوں تو یہ میرے بڑے پرانے ملنے والوں میں ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں جب یہ اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ اُس وقت اُن سے خوب ملنا جُلنا تھا۔ اُن دنوں کالج کے طلبا میں، ان کی شاعری کے بڑے چرچے تھے۔ ایک دھوم تھی۔ چہرے مہرے کے اعتبار سے بھی خوب تھے —— ایک تو اچھے شاعر، دوسرے بے حد ذہین، تیسرے خوبرو، وادہی واد والا معاملہ تھا۔ پھر ذاتی اعتبار سے بھی ملنسار، نستعلیق اور مہذب، ان میں سے کوئی ایک خوبی بھی دماغ خراب کرنے کے لیے کم نہیں ہوتی۔ مگر ان کی ذات میں دماغ کی خرابی والی کوئی بات نہ تھی۔

"آپ میرے علاوہ کسی اور جگہ کیوں ٹھہرے؟"

"مروّت کے ہاتھوں مجبور تھا۔"

چنانچہ انھوں نے میرے سامنے اپنے بھتیجے حسین شاہ سے کہا تھا کہ کل صبح آٹھ بجے، صہبا صاحب کے ہاں جانا اور ان کا سامان اُٹھا لانا۔

دوسرے دن، ابھی میں نے شیو نہیں کیا تھا کہ حسین شاہ آ گئے۔ بستر باندھا گیا اور میں علی محمد راشدی صاحب کے ہاں منتقل ہو گیا۔ حسام الدین راشدی صاحب نے زیادہ مہمانوں کی وجہ سے اپنے ہاں نہ ٹھہرایا۔ علی محمد صاحب کے ہاں میرے قیام کا انتظام کر دیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے پیرس کے کسی چھوٹے سے ہوٹل میں آ گیا ہوں۔ اُس وقت تو میں صرف سامان رکھ کر چلا آیا۔ اس لیے کہ مجھے ۹ بجے ریڈیو اسٹیشن پہنچنا تھا۔

ریجنل ڈائرکٹر حمید نسیم سے صبح صبح ہی ملنے کے لیے طے کیا تھا۔ چنانچہ ریڈیو اسٹیشن پہنچ کر معلوم کیا تو پتہ چلا کہ حمید نسیم اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ میں نے ان کے اسٹینو کو اپنا نام لکھ کر چٹ دے دی تاکہ موصوف کو میرے آنے کا علم ہو جائے۔

تھوڑی دیر کے بعد کہیں سے حمید نسیم صاحب میرے پاس آئے اور کہا۔ "چیف انجینئر آئے ہوئے ہیں۔ بعض امور میں ان سے مشورہ ضروری ہے۔ آپ میرے کمرے میں چل کر بیٹھیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اپنے کام سے فارغ ہو کر حمید نسیم صاحب واپس آئے تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ ابھی پرانی ملاقاتوں کو بھولے نہیں ہیں۔ بلکہ کہا —"ایک لمبے عرصے کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔"

میں نے اپنی آمد کا مدعا بیان کیا تو کہنے لگے۔"ہاں ہاں انصار ناصری صاحب نے بھی مجھ سے آپ کے اس کام کے بارے میں کہا تھا ——— اِدھر اُدھر ٹیلیفون کیے کہ شوکت تھانوی کی وفات پر جو تعزیتی پروگرام نشر ہوا تھا۔ اُس کی نقلیں فوراً مہیا کی جائیں۔"

تھوڑی دیر کے بعد پتہ چلا کہ کراچی سے جو پروگرام نشر ہوا تھا۔ وہ تحریری نہ تھا بلکہ زبانی تھا۔ اس لیے اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ——— یہ سن کر مجھے کچھ افسوس ہوا۔ مگر اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھا، اِدھر اُدھر کی چند باتیں کر کے واپس آ گیا۔ اُن باتوں میں میری طرف سے یہ بات بھی تھی کہ"آپ بہت کم کہتے ہیں۔ بہ حیثیت شاعر آپ نے ادھر کوئی توجہ نہیں کی۔"

کہنے لگے۔ سال میں چھ سات غزلیں تو ہو جاتی ہیں۔ مگر جو اصرار کر کے لے جاتا ہے۔ وہ تو لے جاتا ہے۔ جو نہیں پوچھتا۔ اس کے لیے میں بہت کم کہتا ہوں۔ یہ اشارہ تھا میری طرف اور اپنے سابقہ تعلقات کی بنا پر یہ شکایت بجا بھی تھی۔ اس لیے میں نے خفیف ہو کر کہا —"اب

حمید نسیم کو مجھ سے شکایت نہ ہو گی۔"

"نہیں شکایت تو مجھے اب بھی نہیں ہے۔"

"آپ کو شکایت ہو نہ ہو۔ مجھے تو آپ نے میری زیادتی کا احساس دلا دیا۔"

حمید نسیم سے مل کر باہر نکلا تو ریڈیو اسٹیشن پر ہی انتصار حسین مل گئے ایک صاحب ہیں، انتظار حسین۔ ایک صاحب ہیں انتصار حسین۔ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ ایک اخبار سے متعلق ہیں۔ ایک ریڈیو سے، میں اس وقت بات انتصار حسین کی کر رہا ہوں۔ جو ریڈیو سے متعلق ہیں۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ان سے سلام دعا ہوئی تھی۔ جو کرب اور بے چینی، میں نے ان کے چہرے پر اُس وقت دیکھی تھی۔ وہی آج بھی دیکھی جا سکتی ہے انھیں دیکھ کر پیار اور ترس کے جذبے بیک وقت عود کر آتے ہیں۔ ترس کھانا میرے بس میں ہے۔ پیار کرنا میری حدود سے باہر! — ویسے میں اپنی حد تک ان کے خلوص کا بھی مداح ہوں۔ یہ میرے ایسے کرمفرماؤں میں ہیں۔ جن سے ذہنی قربت رہی ہے۔ پہلے تو یہ کئی برس تک لاہور میں رہے۔ پھر کراچی چلے گئے اور ریڈیو میں اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ جب سے اب تک یہیں چپکے ہوئے ہیں۔ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی۔ مگر یہ اسٹاف آرٹسٹ ہی ہیں اور اسٹاف آرٹسٹ ہی رہیں گے

—— بڑی محبّت سے ملے۔ اپنے ہاں ٹھہرنے پر زور دیا۔ ہم نے کھڑے ہی کھڑے دُنیا جہان کی باتیں کر ڈالیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا۔ "ریڈیو کے دوستوں کو تو ملتے جاؤ۔"

پہلے حامد عزیز مدنی کے کمرے تک گئے۔ معلوم ہوا میٹنگ ہو رہی ہے۔ فرض ادا ہُوا۔ یہ میٹنگیں بھی، بعض اوقات پردہ پوشیوں کے لیے نقاب کا کام دیتی ہیں۔ اس کے بعد یہ مجھے جمیل قمر کے پاس لے گئے۔ جو بڑی اچھی طرح ملے۔ اس سے پہلے میں ان سے کبھی ملا نہ تھا۔ اس لیے میں تو چپ چاپ بیٹھا رہا۔ مگر ان کی مروّت اور "عقیدت" نے مجھے قریب کر لیا۔ میں جمیل قمر کے سلسلے میں اس لیے گم سم تھا کہ یہ نئی پود کے شاعر، شاعری اور ادب کے ناخداؤں کو بھی ماننے سے انکار کر دینے والے ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں کی ذہانتوں کا امتحان لینے میں، کبھی اپنی اور کبھی اساتذہ کی پگڑی کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

انتصار حسین نے کہا۔ "عرشِ منیر سے نہ ملیے گا۔"؟

"ضرور ملوں گا۔" اس پر جمیل قمر نے چپڑاسی سے کہا۔ "ذرا دیکھو کہ عرشِ منیر آگئی ہیں؟"

چپڑاسی نے آکر بتایا۔ "ابھی نہیں آئی ہیں۔"

عرشِ منیر کون ہیں؟ ان سے متعلق بھی ایک عجیب داستان ہے۔

اس سے پہلے جب میں ۱۹۵۸ء میں کراچی آیا تھا تو عرش منیر سے بھی تعارف ہوا تھا۔

کسی نے میری طرف اشارہ کرکے کہا تھا کہ یہ شوکت تھانوی کے دوست طفیل صاحب ہیں تو اس پر عرش منیر نے اپنا تعارف خود کراتے ہوئے کہا تھا۔ "میں شوکت تھانوی کی بیوی عرش منیر ہوں۔"

"بیوی؟"

"جی ہاں!"

"میں تو ان کی صرف دو بیویوں کو جانتا ہوں۔"

"آج تو تیسری سے بھی ملاقات ہوگئی نا؟"

"عجیب حیرت کی بات ہے۔"

"حیرت کی کیا بات ہے۔ میرے بطن سے شوکت صاحب کے تین بچے بھی ہیں۔"

"تین بچے بھی؟"

"جی ہاں!"

"اچھا بھئی لاہور جاکر شوکت صاحب سے پوچھوں گا کہ تیسری بھابی سے ملاقات، اتنے برسوں کے بعد اب جاکر ہوئی ہے۔ مگر آپ نے خود کبھی نہ بتایا۔"

"ہاں ہاں ضرور پوچھیے گا"

چنانچہ لاہور آ کر میں نے شوکت صاحب سے عرشِ منیر کے بارے میں استفسار بھی کیا تھا۔ جس پر شوکت صاحب نے یہ کہا تھا ــــ "نابالغوں کو بڑوں کی باتوں میں بولنے کا حق نہیں" ــــ اور پھر قدرے سکوت کے بعد یہ بھی کہا ــــ "تمھیں بہکایا گیا ہے"

بہرحال یہ وہی عرشِ منیر تھیں کہ جن سے ۱۹۵۸ء میں یوں اور اس نوع کی ملاقات ہوئی تھی۔ اب جب انتصار حسین نے کہا کہ عرشِ منیر سے نہ ملیے گا تو میں نے شوکت تھانوی کے کسی بھی رشتے کی رُو سے ملنے سے انکار نہ کیا۔ مگر وہ موجود نہ تھیں۔

۲۰
قدم

ریڈیو اسٹیشن کے سامنے ابنِ انشا کا دفتر تھا۔ کسی نے مجھ سے کہا کہ ابنِ انشا کا پیغام یہ ہے کہ طفیل سے کہہ دینا مجھے ملے بغیر نہ جائے۔ چنانچہ میں ان کے ہاں پہنچا۔ تھوڑے سے گلے شکوے ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے دفتر کی اہمیت پر مختصر سا لکچر پلایا۔ حقِ نمک ادا کیا۔

کبھی ابنِ انشا سے بھی بڑے پیار کے مراسم تھے۔ مگر یہ بات

ابنِ انشا :

چین سے دوستی بعد میں ہوئی۔ مگر یہ چینی باشندہ یہاں پہلے سے موجود ہے۔ جس طرح ہمیں چو۔این۔لائی پر بھروسہ ہے۔ اسی طرح دوستوں کو ان پر بھروسہ ہے۔ وقت پڑنے پر یہ کیا کریں گے۔ اس کے بارے میں ابھی کیا کہا جاسکتا ہے[1]۔ سیاست ہے۔ جدھر بھی پلٹا کھا جائے۔ اس کی زد میں دوست آئیں تو، ملک آئیں تو، ایک چین کا وزیرِ اعظم ہے۔ دوسرا گلڈ کا وزیرِ اعظم!

---

[1] یہ مضمون ۱۹۶۳ء میں لکھا گیا تھا۔ اُس وقت صورتِ حال یہی کچھ تھی۔ مگر اب معاملہ سولہ آنے اعتماد والا ہے۔

اس وقت کی ہے ۔ جب رائٹرز گلڈ کا وجود نہ تھا اور ابنِ انشا شاعر تھے ۔ لیڈر نہ تھے ۔ میرے چند ہی دوست ایسے ہوں گے ۔ جو ابنِ انشا ایسے دوستوں کی صف میں آتے ہوں ۔ مگر رائٹرز گلڈ کا قیام کیا عمل میں آیا ۔ بیشتر دوستوں کے دماغ اپنی اصلی سطح سے اُونچے ہو گئے ۔ جب میں نے موصوف کا ایسا رویّہ دیکھا تو میں بھی پیچھے ہٹ گیا ۔ اس لیے کہ میں دُور ہٹنے والوں کے پیچھے کبھی نہیں گیا ۔ اسے میری دنیا دی غلطی سمجھیں تو نالائقی سمجھیں تو ۔ بہر حال ہے کچھ کچھ ایسا ۔

ہاں تو، میں یہ کہہ رہا تھا کہ ابنِ انشا میرا بڑا پیارا دوست تھا ۔ چنانچہ اس ملاقات پر بھی میں نے انھیں چھیڑا ۔ "یار آپ تو جیتے جی مر گئے ۔"

"نہیں ! ابھی میں زندہ ہوں ۔"

"خاک زندہ ہیں ۔"

"نہیں پانچ چھ نظمیں، نامکمل پڑی ہیں ۔ اگر وہ مکمل ہو گئیں تو پھر دیکھ لینا ۔ ڈنکے بجیں گے ۔"

"اجی ! وہ زمانہ لد گیا ۔"

اتنے میں انھوں نے جمیل الدین عالی کو ٹیلیفون کیا کہ طفیل صاحب آئے ہوئے ہیں اور آپ کی خیریت پوچھتے ہیں ۔"

اس پر عالی صاحب نے کہا ۔ "طفیل کو روکے رکھو ۔ میں اپنی

گاڑی بھیجتا ہوں۔ اس پر اسے سوار کرا دو۔"

جب ابنِ انشا نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا۔

"اس وقت تو میں ہاجرہ بہن کے ہاں جا رہا ہوں۔ پھر کسی وقت مل لوں گا۔"

مگر عالی صاحب نے کہا۔ "صرف چند منٹ کے لیے سہی!" — اس کے بعد ابنِ انشا نے ٹیلیفون مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "خود ہی طے کر لیجیے۔"

جب عالی صاحب سے باتیں ہوئیں تو میں نے کہا۔ "بہت اچھا آپ سے ملتا ہوا چلا جاؤں گا۔"

اس پر عالی صاحب نے فقرہ کسا۔ "اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو کسی کے بھی کہنے پر اِدھر نہ آتا۔ اُدھر ہی جاتا۔"

اس فقرے پر میں جھلّایا۔ اور اس جھلّاہٹ میں کہا۔ "میرے نزدیک دونوں کا درجہ ایک ہے۔ ایک گلڈ کی بہن، دوسری میری بہن!"

بہرحال گاڑی آگئی۔ میں اس میں سوار ہوا۔ گاڑی پریذیڈنٹ ہاؤس جا کر رُکی۔ معلوم ہوا عالی صاحب یہیں رہتے ہیں۔ یہیں بیٹھتے ہیں۔ اس وقت وہ جس کمرے میں بیٹھے تھے۔ اُس کمرے میں قدرت اللہ شہاب بیٹھا کرتے تھے۔ مگر یہ اُن دنوں کی بات ہے کہ جب پاکستان کا صدر مقام
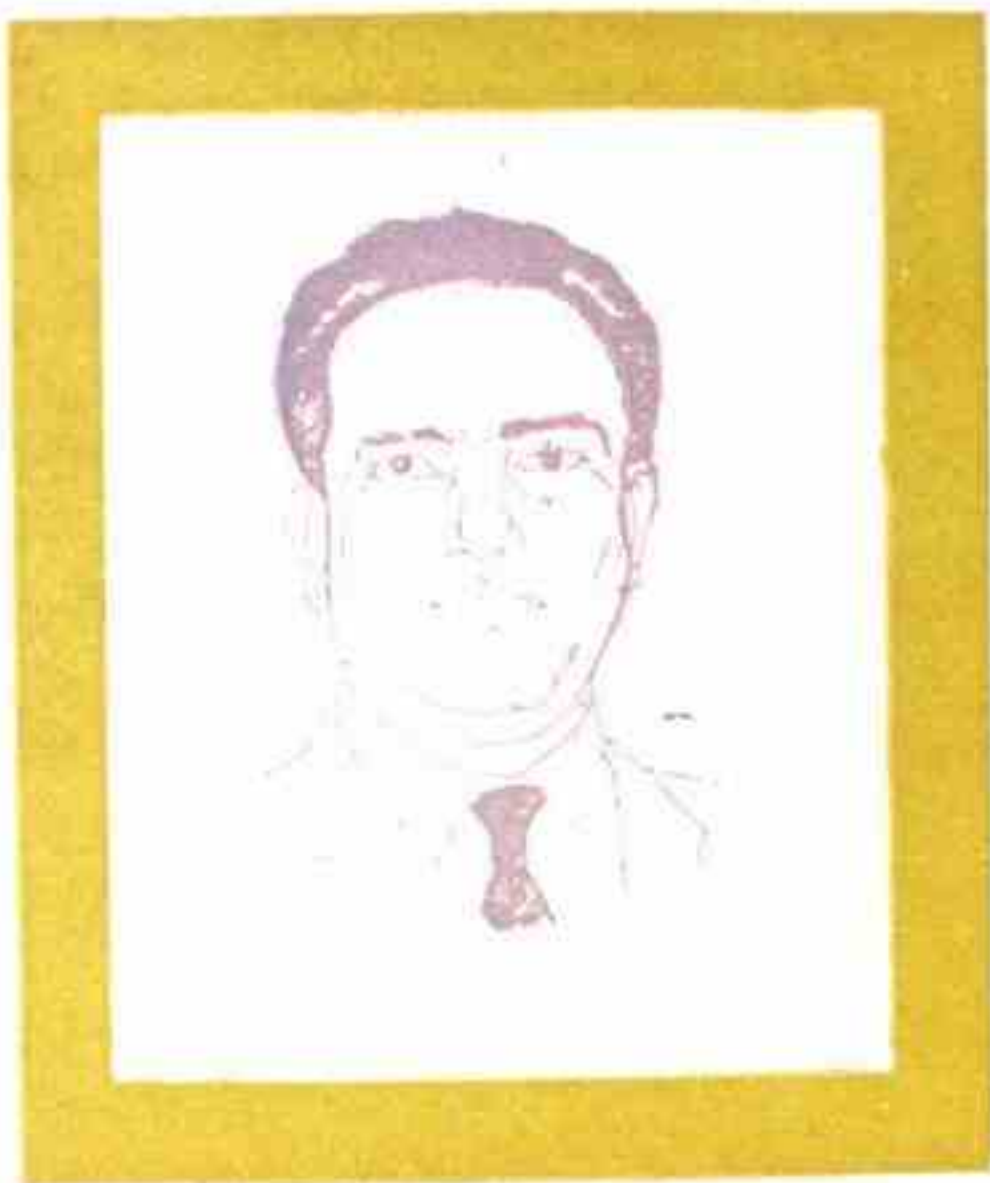
جمیل الدین عالی

ڈکٹیٹرانہ شان رکھنے والے مگر مصلحت آمیزی میں طاق، معاملہ فہم مگر ضد کے بادشاہ، مخلص اتنے کہ مسکرا مسکرا کے رجھا دیں۔ جانب دار اتنے کہ اصول شرما جائیں۔ رائٹرز گلڈ کے ناخدا مگر خود گلڈ کی دریافت!

نامِ نامی جمیل الدین عالی!

اور ساتھ ہی ــــ ایک بے حد معتبر آدمی!

اس معتبر آدمی کے جو لوگ قریب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت اچھے آدمی ہیں۔

اسلام آباد نہیں، کراچی تھا - چنانچہ میں نے کہا "آپ جس کرسی پر بیٹھے ہیں یہ کرسی تو شہاب صاحب کی ہے"

"ہاں انہی کی ہے - میرا کمرا پیچھے ہے - مگر یہاں بیٹھنے میں سہولت اور آرام ملتا ہے"

عالی صاحب نے شکایت کی "آپ نے زبان کا مسئلہ چھیڑا تو مجھے لکھنے کو نہ کہا - حالانکہ میرا جی چاہتا تھا کہ کچھ لکھوں"

"تو پھر بسم اللہ!"

"اچھا لکھوں گا - یہ جو آپ نے خود نوشت سوانح نمبر کا اعلان کیا ہے - یہ مجھے پسند آیا - میرا دل پسند موضوع ہے یہ، مگر یہاں کس میں ہمت ہے کہ وہ اپنے بارے میں سچ سچ لکھ سکے - کون پسند کرے گا کہ وہ اپنی خامیوں کو بھی اجاگر کرے اور کون ہے جو اپنے معاشقوں کے بارے میں لکھے گا اور پھر کس خاتون میں اتنی ہمت ہے کہ وہ اپنی ایسی باتیں لکھ سکے - میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کے اس نمبر میں جو کچھ چھپے گا - وہ سب جھوٹ ہوگا"

"یہ تو ٹھیک ہے کہ سچ بولنا، بڑا مشکل کام ہے - مسٹر گاندھی نے بھی اپنے بارے میں بہت کچھ لکھا - مگر ابھی بہت کچھ ایسا ہوگا - جسے وہ لکھ نہ سکے ہوں گے - اسی طرح، اس دور کے ادیب بھی کچھ نہ کچھ تو کہہ ہی دیں گے — میں نے اپنی طرف سے بڑی وضاحت کے ساتھ خط

لکھے ہیں کہ کمزوریوں کے اظہار سے کسی ادیب کی عظمت گھٹے گی نہیں — بڑھے گی۔"

"آپ جو چاہیں لکھیں۔ مگر کوئی ادیب سچ نہ لکھے گا۔ اس موضوع پر لکھنے کے لیے روسو جیسا فراخ حوصلہ انسان چاہیے۔"

"میرا خیال ہے میر کے زمانے سے آج کے ادیب زیادہ سچے ثابت ہوں گے۔"

"یار میں تمھیں اس موضوع پر ایک خط لکھوں گا۔ وہ چھاپ دینا۔ اس میں یہی باتیں ہوں گی۔ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔"

"بہت اچھا لکھیے۔ میں چھاپ دوں گا۔"

اس کے بعد میں نے کہا۔ "مجھے ٹیکسی منگوا دیجیے۔ میں جاؤں گا۔ بڑی دیر ہو گئی ہے۔ ہاجرہ بہن میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

ٹیکسی کے آنے تک میں نے عالی صاحب سے کہا — "میں گلڈ کی مجلسِ عاملہ کا رُکن ہوں۔ موجودہ طریقِ کار کو دیکھ کر سوچتا ہوں کہ مجھ سمیت سب کا وجود بیکارِ محض ہے۔ میں چاہتا تھا کہ گلڈ کی کچھ خدمت کر دوں۔ مگر ڈھانچہ اور ضابطہ کچھ ایسا ہے کہ ڈیڑھ برس میں کل تین تو میٹنگیں ہوئی ہیں۔ چند امور پر باہم غور کر لیا۔ کام ختم، ہم لوگ عملی طور پر تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ آفس سیکرٹری ہی سب کچھ کرتا ہے۔ مگر اسے

آپ کی ہدایات پر عمل کرنا پڑتا ہے" ــــ ساتھ ہی یہ بھی کہا ــــ "بڑا اچھا ہوا کہ آپ ہمارے قریب آئے۔ ورنہ پہلے تو ہمارے اور آپ کے درمیان بڑے فاصلے تھے۔ ایک دوسرے کو بڑے غلط رنگ میں سمجھ رہے تھے۔"

فاصلے والی اور غلط رنگ میں سمجھنے والی تلمیح یہ ہے کہ ایک زمانے میں، انتخابی پرچوں اور ادبی پرچوں کے درمیان جو قلمی جنگ تھی۔ اس میں عالی صاحب کا رول، جانبدارانہ تھا۔ اس سلسلے کی، جو آپس میں خط و کتابت ہوئی تھی۔ اس میں میں نے صاف صاف لکھا تھا کہ آپ اصولی باتوں کو نظر انداز کرکے، نہ صرف مدیرانِ جرائد کو نقصان پہنچا رہے ہیں بلکہ ادیبوں کو بھی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس پر عالی صاحب نے اور باتوں کے ساتھ ایک بڑا دلچسپ فقرہ لکھا تھا کہ "لوگوں نے تو ام المومنین عائشہ صدیقہؓ پر بھی الزام لگا دیا تھا۔ پھر بھلا میں کس کھیت کی مولی ہوں۔"

اُن دنوں میں اکثر اس فقرے پر سوچا کرتا تھا کہ آخر عائشہ صدیقہؓ کے حوالے سے جمیل الدین عالی کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

اتنے میں ٹیکسی آگئی۔ میں نے ہاجرہ بہن کو ٹیلیفون کیا کہ حاضر ہو رہا ہوں۔ مکان میرا دیکھا ہوا نہ تھا۔ اس لیے میں نے کہا کہ اپنے نوکر کو سڑک پر بھیج دیجیے تاکہ وہ مجھے بھٹکنے سے بچالے۔ اس پر ہاجرہ بہن نے بہنوں والی بات کہی ــــ "میں ہی جاکر سڑک پر کھڑی ہو جاتی ہوں۔ آپ آئیں تو۔"

ہاجرہ مسرور :

یہ مجھے بھائی کہتی ہیں۔ میں انھیں بہن کہتا ہوں۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ کہ یہ مجھے بھائی سمجھتی ہیں۔ میں انھیں بہن سمجھتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے جلتے ہیں۔ میں ان کی ادیبانہ شہرت سے، وہ میری مدیرانہ صلاحیت سے ۔

ہاجرہ سے جب میری پہلے پہل ملاقات ہوئی تھی تو اس وقت بھی یہ بہت کچھ تھیں۔ مگر اب تو صاحب! اتنی دانا، اتنی سوجھ بوجھ والی اور اتنی معتبر ہوگئی ہیں کہ میں ان کی طرف دیکھتا رہ جاتا ہوں۔

مقررّہ جگہ پر پہنچا تو بہن کھڑی تھیں۔ مسکرا کر ملیں۔ گھر پہنچے تو بیٹھتے ہی کہا۔ ”پہلے کھانا کھا لیں۔ بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔“

کھانا کھایا۔ جس میں قطعاً کوئی تکلّف نہ تھا۔ میں ان کے ہاں کوئی چار گھنٹے رہا۔ پھر بھی ایسا محسوس ہوا۔ جیسے ابھی آیا تھا۔ ابھی جا رہا ہوں۔

ہم نے دنیا جہان کے موضوعات پر باتیں کیں۔ ہاجرہ بہن کو شکایت یہ بھی تھی کہ میں ان کے ہاں کیوں نہیں ٹھہرا۔ وہ کہتی تھیں ”لاہور سے جو کوئی بھی اپنا آئے اُسے میرے ہاں ٹھہرنا چاہیئے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ اس کوٹھی کا نام ”لاہور ہاؤس“ رکھ دیں۔“

”جی تو یہی چاہتا ہے۔ مگر یہ جگہ اپنی نہیں۔“

ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ کراچی والے کہتے ہیں کہ اب کراچی کو ہی اپنا گھر سمجھوں۔ مگر یہ مجھ سے نہ ہو گا۔ پنجاب نے مجھے پناہ دی۔ میں اس کا یہ احسان کبھی نہیں بھُول سکتی۔

ہوتے ہُواتے باتیں ”فنون“ کے تبصرہ پر نکلیں۔ میں نے کہا کہ میں نے تو اپنی طرف سے بڑے پیار کے ساتھ تبصرہ کیا تھا۔ مگر بعض ”خیر خواہوں“ نے یہ بات چلائی کہ تبصرہ حق میں نہیں۔ خلاف ہے۔ وہ تبصرہ یہاں نقل کرتا ہوں۔ ذرا آپ بھی دیکھیں:۔

”یہ رسالہ (فنون) احمد ندیم قاسمی اور حبیب اشعر

کی ادارت میں نکلا ہے۔ مدیرانِ رسالہ سے، اس ادارہ کے تعلقات ایسے ہیں کہ ہمیں اس رسالے میں کوئی برائی نظر ہی نہیں آتی۔ ان حالات میں تبصرہ کیا لکھا جا سکے گا۔ لہٰذا دونوں جہان رکھنے کے لیے رسالے کا تعارف کرائے دیتے ہیں۔

"فنون" ایک نیا رسالہ ہے۔ ادبی رسالے روز نکلتے ہیں روز بند ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے رسالے روز نہیں نکلتے۔ نہ اس رسالے میں اتنی "اہلیت" نظر آتی ہے کہ بند بھی ہو سکے۔ یہ جو اب نکلا ہے تو ان شاء اللہ نکلتا ہی رہے گا اور اس کے ذریعہ ایسا ادب پیش ہوتا رہے گا۔ جو کارآمد، مفید اور زندہ ہو۔

زیرِ نظر شمارہ بڑی محنت سے چھاپا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں تقریباً سبھی لکھنے والے موجود ہیں، بڑے بڑے افسانہ نگار، مضمون نگار اور شاعر۔ ان حالات میں اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ہماری ناچیز رائے میں فلاں چیز اچھی ہے اور فلاں بُری تو ڈر بجائے مدیرانِ رسالہ کے اُن ادیبوں کا ہے۔ جن کی چیزیں فنون کی زینت ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ اگر کسی رسالے میں دو چار چیزیں

بھی کام کی نکل آئیں تو زندہ باد کا نعرہ لگانے کو جی چاہتا ہے۔
کیونکہ اس دور کے ادیب لکھنے کو "جی کا جنجال" سمجھنے لگے ہیں
جی کا جنجال تو ہے ہی۔ اس لیے کہ واہ واہ سے روح کا رشتہ
تن سے برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ پہلے ادیب کے لیے لکھنے کا
مسئلہ زیادہ تر ذہنی تسکین کے لیے تھا۔ آج ذہنی تسکین کے ساتھ
روٹی کا بھی مسئلہ ہے۔ ایسے حالات میں جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا
جا رہا ہے۔ وہ بڑا غنیمت ہے۔ بے حد غنیمت! ـــــ اور
مدیر اِن فنون نے موجودہ حالات میں جتنی چیزیں پیش کی ہیں۔
وہ اپنی جگہ قابلِ قدر ہیں ـــ اور ہم ایک اچھے رسالے کا
پوری گرمجوشی کے ساتھ استقبال کرتے ہیں۔"

ہاجرہ بہن نے بھی اس تبصرے پر یوں تبصرہ کیا کہ اسے چاہیے خلاف سمجھ لیا جائے۔ چاہے حق میں، میں تو اس تبصرے کو حق میں سمجھتی ہوں۔
جب اپنوں نے بھی یوں سوچا کہ تبصرہ بڑا "کھچرا"[1] تھا۔ تو غور کرنا ہی پڑا۔ کہ طبیعت میں جو ہلکی سی شرارت ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر سہی، مگر اپنوں کو بھی نہیں بخشتی۔ اس لیے مجھے اپنے آپ سے کہنا پڑا ـــ شرم کرو طفیل شرم کرو۔

میری خواہش تھی کہ احمد علی خاں صاحب سے بھی ملاقات

---

[1] یہ لفظ پنجابی ہے۔ جس کے معنی "چت بھی اپنی، پٹ بھی اپنی" قسم کے ہیں۔

ہو جاتی۔ مگر وہ اپنے دفتر گئے ہوئے تھے۔ پہلے تو ارادہ یہ ہوا، کہ ڈان کے دفتر ہی میں ان سے مل لوں۔ پھر باتوں باتوں میں جب پانچ بج گئے تو خان صاحب بھی آ گئے۔ اکٹھے چائے پی۔ دو گھڑی خوشیوں میں اور اضافہ ہوا۔ احمد علی خاں اتنی پیاری شخصیت کے مالک ہیں کہ میں آپ سے کیا کہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ان کے اخلاق اور اخلاص کا عاشق ہوں۔

ہاجرہ بہن اور احمد علی خاں صاحب سے، سوا پانچ بجے کے قریب یہ وعدہ کر کے رخصت ہوا کہ جانے سے پہلے یا تو ایک بار پھر آؤں گا۔ یا ٹیلیفون کروں گا۔ نہ تو دوبارہ جا سکا۔ نہ ہی ٹیلیفون پر بات ہو سکی۔

رات کو حاجی محمد عمر صاحب کے ہاں کھانے پر جانا تھا۔ اس لیے ناک کی سیدھ میں اپنی عارضی رہائش گاہ پر پہنچا۔ آتے ہی لیٹ گیا۔ تھکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ کوئی سوا سات بجے آنکھ کھلی۔ جلدی سے نہایا۔ اس لیے کہ غلام حسین مصطفےٰ صاحب مجھے لے جانے کے لیے آن موجود ہوئے تھے۔ یہی وہ دعوت تھی۔ جو شاہد احمد دہلوی کی دعوت کو رکوا کر دی گئی تھی۔ کھانے پر شاہد صاحب بھی تشریف لے آئے۔ اس لیے میں نے اپنے آپ کو زیادہ مجرم نہ پایا۔ اگر نہ آتے تو میں اس دعوت سے اٹھ کر سیدھا ان کے ہاں جاتا اور کہتا کہ لائیے صاحب جو گھر میں پکا ہوا موجود ہو۔ مجھے کھلائیے۔ مگر

شاہد صاحب کی آمد نے مجھے پریشان ہونے سے بچا لیا۔

حاجی محمد عمر صاحب میمن ہیں۔ تجارت ان کا پیشہ ہے۔ مگر لکھنے پڑھنے والوں سے دلچسپی ہے۔ اچھی خاصی لائبریری ہے۔ مطالعہ بھی اچھا ہے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ آدمی عمدہ ہیں۔ حد درجہ کی انکساری کے ساتھ، اپنی محبت کا یقین، منٹوں میں دلا دیتے ہیں۔ کھانے پر بھی بے حد اہتمام کیا ہوا تھا۔ مگر آج کھانا میمنوں والا نہ تھا۔ پہلے تو ایک بہت ہی بڑے تھال میں طرح طرح کے کھانے سجا کے اور سب اکٹھے بیٹھ کے کھانا کھایا کرتے تھے۔ جو مجھے اپنے نئے پن (میرے لیے نیا پن) کی وجہ سے بڑا اچھا لگتا تھا۔ مگر آج کھانا ویسا ہی تھا، جیسا اونچے گھروں میں کھایا جاتا ہے۔ اور تو سب کچھ ٹھیک تھا مگر وہ انفرادیت نہ تھی۔ مجھ میں جہاں سینکڑوں عیب ہوں گے۔ ایک عیب یہ بھی ہے کہ انفرادیت پر مرتا ہوں۔

دوسرے دن صبح ہی صبح شاہد احمد دہلوی کو ٹیلیفون کیا کہ آپ جوش نمبر کے سلسلے میں جو کچھ کر رہے ہیں۔ اس میں کہیں اس خاکسار کا نام تو نہیں۔ یہ یوں پوچھا کہ ہماری آپس میں اسی موضوع پر دو مہینے سے خط و کتابت چل رہی تھی۔ شاہد صاحب نے کہا۔ ادھر آجائیے تاکہ ذرا سوچا جائے۔

ملاقات پر جانبین کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی تھی۔ اس کا چھا پنا طے پا گیا۔ اس خط و کتابت میں اور کچھ تھا کہ نہیں۔ مگر اس سے بعض معاملات
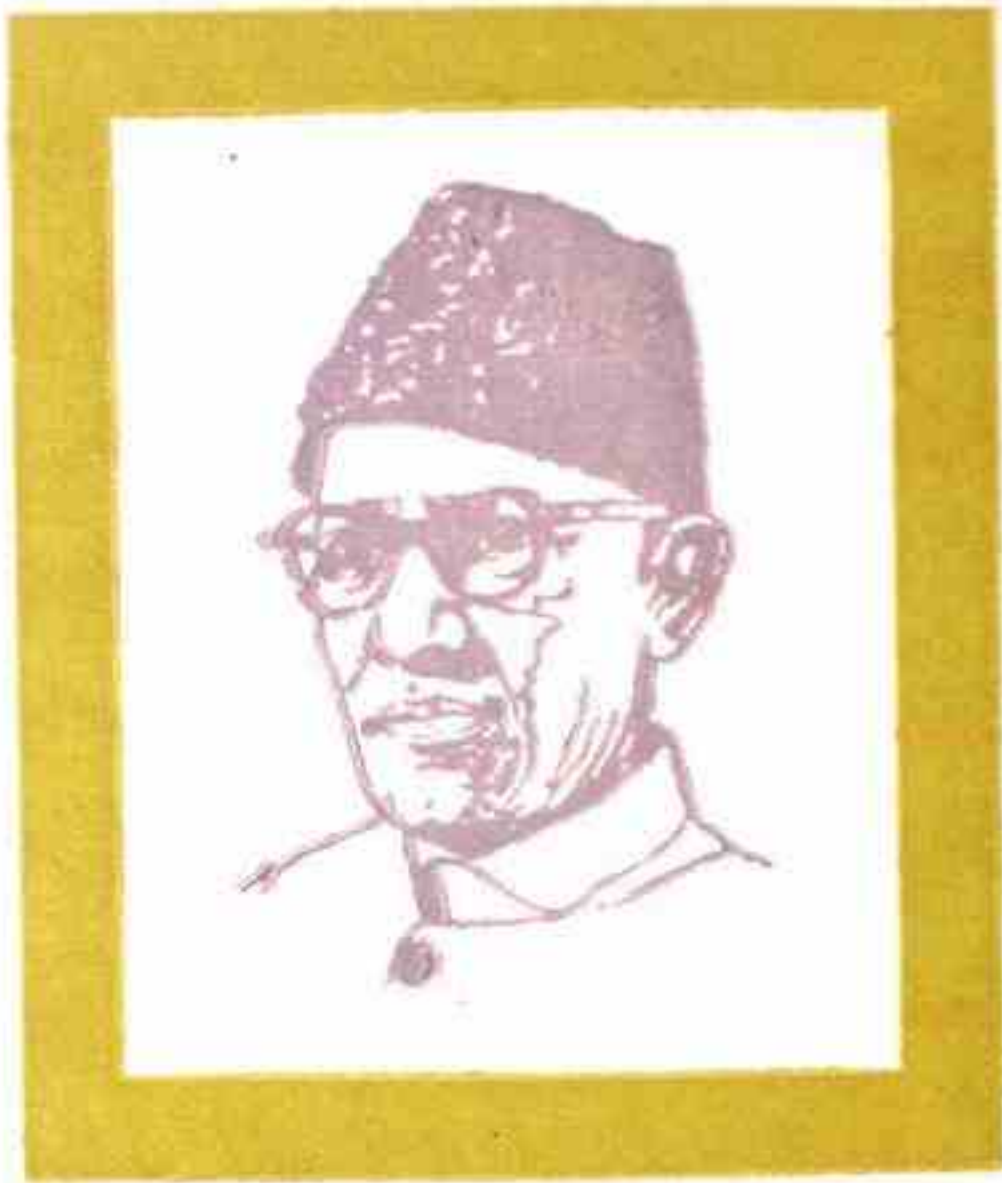
شاہد احمد دہلوی :

پہلے لوگ کوتوال شہر سے ڈرتے تھے۔ آج کل شاہد احمد دہلوی سے ڈرتے ہیں۔ وہ ڈنڈوں سے خبر کس نکالتے تھے۔ یہ قلم سے خبر لیتے ہیں۔ اُن کی مار وقتی تھی۔ ان کی مار برسوں رُلاتی ہے۔ یہ اتنے منہ پھٹ نہیں۔ جتنے قلم پھٹ ہیں۔ اس کے باوجود یاروں کے یار ہیں۔ دشمنوں کے دشمن ہیں۔ مگر کبھی کبھار لیڈری کے شوق میں دوستوں کے بھی لتے لے بیٹھتے ہیں۔ ان خوبیوں کے علاوہ اڑے بخت ہیں کام بھی آتے ہیں۔ کام کے لکھنے والے ہیں۔ اُردو گھر کی لونڈی جو ہوئی۔ بہرحال ان سے کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ گنوایا نہیں جا سکتا۔

کی وضاحت ضرور ہوتی تھی۔ اس لیے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ جب خطوط کا چھپنا ہی طے پایا تو میں نے کہا۔ اسی سلسلے کا ایک خط، جوش صاحب کا بھی میرے پاس ہے۔ کہیے تو وہ بھی بھیج دوں تاکہ ان خطوط کی اشاعت کا کچھ مقصد بھی ہو جائے۔ جسے شاہد صاحب نے پسند کیا۔

شاہد صاحب کے ہاں پہنچا تو وہ خطوں کی اُونچ نیچ کے بارے میں سوچتے رہے اور مجھے اپنا نیا لکھا ہوا مضمون "حفیظ جالندھری" دکھایا اور کہا کہ ذرا اسے پڑھ کر اپنی رائے دیں۔ غالباً رائے کی ضرورت شاہد صاحب نے اس لیے سمجھی ہو گی کہ بعض اوقات لوگ سیدھی سادھی باتوں کو بھی غلط رنگ میں اچھال کر بدمزگی پیدا کرا دیتے ہیں۔ پھر یہاں تو معاملہ "یو۔پی" اور "پنجابی" کا بھی تھا۔

وہ مضمون میں نے پڑھا۔ جسے شاہد صاحب نے بڑا سنبھل سنبھل کر لکھا ہوا تھا۔ میرا خیال نہ تھا کہ شاہد صاحب کبھی بھی اپنی مرضی کے خلاف کچھ لکھیں گے۔ مگر یہ مضمون لکھا۔

جب میں مضمون پڑھ چکا تو شاہد صاحب نے رائے پوچھی۔ میں نے صاف کہہ دیا۔" اس مضمون سے آپ کے ادبی وقار کو ٹھیس پہنچے گی، اور حفیظ صاحب کو فائدہ پہنچے گا"۔ مگر مجھے یوں خوشی بھی ہوئی کہ شاہد صاحب کے سامنے اب معاملات کی نزاکتیں بھی آنے لگیں۔ ورنہ اس سے پہلے

شاہد صاحب کا قلم یہی کہتا رہتا تھا۔ ہمیں کسی لاٹ صاحب کی پروا نہیں۔

شاہد صاحب کے ہاں سے اُٹھ کر جوش صاحب کے دفتر میں آگیا۔ اس لیے کہ دوسرے دن، میری واپسی تھی۔ جوش صاحب سے جب لاہور میں ملاقات ہوئی تھی تو میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ اب آپ سے جلد ہی کراچی میں ملاقات ہو گی۔

جوش صاحب کے ہاں پہنچنے سے پہلے، میں نے انھیں احتیاطاً ٹیلیفون کیا —— "اگر فارغ ہوں تو آجاؤں۔"

"اجی فراغت کی ایسی تیسی، آپ آجائیں۔"

میرے پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ ٹیکسی والے نے انجان سمجھ کر بڑے چکر دیے۔ یہی وجہ تھی کہ جوش صاحب نے کہا۔ "بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔"

"ٹیکسی والے کے بس میں تھا۔ خوب چکر دیے اُس نے۔"

"ہاں صاحب! ہمارا ضابطۂ اخلاق اب یہ رہ گیا ہے۔ جب شاعر اور ادیب گھٹیا ہوگئے ہوں تو کسی اور سے کیا گِلہ، شاعر اور ادیب جو پیغمبرِ انسانیت ہوتے ہیں۔ وہ گھٹیا ہوگئے ہیں۔"

"ابھی اپنے شاعر اور ادیب ٹیکسی والوں سے تو اچھے ہیں۔"

"جی ہاں ابھی تھوڑا سا فرق باقی ہے۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "جناب! آپ ہندوستان سے جو اتنے آموں کے ٹوکرے لائے تھے۔ ان میں سے کچھ باقی ہیں یا نہیں؟"

"جی ہاں ہیں۔ ابھی منگواتا ہوں"۔ اس کے بعد گھنٹی بجی، ملازم آیا تو اس سے جوش صاحب نے فرمایا "دیکھو گھر جاؤ۔ اُمّ الشعرا سے کہنا لاہور سے ایک بدمعاش آیا ہے۔ اس کے لیے آم دے دیں"۔

"جوش صاحب لاہور میں گرمی کا کیا عالم تھا؟"

"ارے صاحب کچھ نہ پوچھیے۔ جہنم میں بھی اتنی گرمی نہ ہو گی جتنی آپ کے لاہور میں تھی۔ آدمی توے کا کام دے رہا تھا۔ اگر اس پر روٹی لگا دی جاتی تو وہ پک جاتی"۔

"دلّی میں بھی تو اتنی ہی گرمی ہو گی"۔

"جی ہاں! دلّی اور لاہور برائیوں میں بھائی بھائی ہیں۔ مگر صاحب ہندوستان میں دن بڑے اچھے گزرے۔ ملیح آباد میں بہت سے دوستوں کی دعوت کی۔ درختوں پہ جھولے ڈالے۔ خوب دھما چوکڑی رہی"۔

"آم بھی کھائے؟"

"ہاں صاحب کھائے بھی، کھلائے بھی، اب کے فصل بڑی اچھی ہوئی۔ پچیس ہزار میں باغ بکے، مگر ہم وہ روپیہ یہاں لا نہیں سکتے۔ وہیں جمع

کرانا پڑا۔ ملیح آباد تو سارے کا سارا باغی ہے (باغ کی رعایت سے : باغی) لوگوں کی روٹیاں ٹہنیوں پہ لٹکی رہتی ہیں۔ آندھی آئی۔ روٹیاں غائب!

"کہاں کہاں رہے ؟"

"میں تو صرف بمبئی، دلّی، ملیح آباد، ہاں کرنال میں ایک مشاعرہ بھی ہوا۔ اس میں بھی شریک ہوا تھا۔ بڑا لطف آیا صاحب کرنال میں، ہوا یہ کہ عین مشاعرے کے وقت، بڑے زور کی بارش ہوئی۔ وہ وقت میرے جام بکف ہونے کا تھا۔ (انھوں نے تو جام بکف کی جگہ طلوع ہونا کہا تھا) لوگ بھاگے اپنے اپنے گھروں کو اور میں شعلۂ دارُو کی آغوش میں آسودہ ہو رہا۔"

"دلی میں کیا کیا ؟"

جو کچھ انھوں نے بتایا۔ وہ سب کا سب لکھنے والا نہیں ہے — بہرحال یہ بھی بتایا کہ پنڈت جی (جواہر لعل نہرو) کی دعوت کی۔ انھوں نے (پنڈت جی) کہا۔ میری بہن کو بھی بلانا۔ چنانچہ اُمّ الشعرا کو ملیح آباد سے بلایا۔ پنڈت جی میرے ساتھ کوئی دو گھنٹے رہے۔"

"پنڈت جی کو پرانے تعلقات کا پاس ہی تھا۔ جو وہ آپ کی دعوت پر آ گئے۔"

"ہاں صاحب! کیا کہنے ہیں۔ ان کی انسان دوستی کے —

پھر مسلمانوں کے لیے پنڈت جی کا دم بڑا غنیمت ہے۔ ان کے بعد اللہ جانے کیا ہو۔"

"پنڈت جی آزادانہ پھرتے ہیں۔ یا ان کے لیے حفاظتی انتظامات کیے جاتے ہیں؟"

"حفاظتی انتظامات کیے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ لوگ وہاں بھی ان کے خلاف ہیں۔ جب پنڈت جی میرے پاس آئے تو ان کی موٹر کی بتیاں گل تھیں۔ مبادا کوئی گولی چلا دے۔ وہاں بھی تو ایک سے ایک مہا سبھائی پڑا ہے۔ جیسے وہاں مہا سبھائی ویسے یہاں 'ملا'، دونوں انتہا پسند۔"

"بہر حال پنڈت جی نے آپ کی دعوت قبول کرکے اپنی بڑائی کا اور ثبوت دیا۔"

"جی ہاں! جس دن دعوت تھی۔ اس دن صبح ہی سے سی۔ آئی۔ ڈی والے کوٹھی کے پھیرے پہ پھیرے لگانے لگے۔ بالآخر ایک لال بجھکڑ میرے پاس آیا اور اس نے پوچھا ——— "پنڈت جی یہاں کیوں آرہے ہیں" ——— میں نے کہا ——— "کمرے کا طول اور عرض دیکھ لو۔ اسی طول عرض کا کوئی آدھ فٹ موٹا گدا بنوایا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آج میری اور پنڈت جی کی کشتی ہو گی۔"

"ہاں صاحب عقلمندوں کی کمی نہ ادھر ہے نہ اُدھر"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ شان الحق حقّی آ نکلے۔ یہ بڑے نستعلیق سے بزرگ ہیں۔ بزرگ اس لیے کہتا ہوں کہ یہ اپنی ذمہ داریوں کے اعتبار سے اس عمر میں بھی بزرگ ہیں۔ ویسے جب یہ واقعی بزرگ ہو جائیں گے تو اپنی زندہ دلی کی بنا پر نوجوان ہی رہیں گے۔ خلوص اور پیار ان کے انسانی مذہب کی ضرورت ہی نہیں، اساس ہیں۔ ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے انھیں سبھی جانتے ہیں۔ مگر میں نے انھیں دیکھتے ہی ایسے شعروں کی فرمائش کر ڈالی، جو کبھی چھپ نہیں سکتے۔ اگر ادب میں ہزلیہ شاعری کو بھی کوئی مقام دیا جاتا تو یہ بلاشبہ ہزلیہ شاعری کے داغ ہوتے۔ وہی زبان کی رعایتیں، وہی سادگی، وہی برجستگی۔ غرض جب یہ اپنے ایسے اشعار سناتے ہیں تو بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے بڈھے بھی یہ کہتے ہیں ؎

غزل اُس نے چھیڑی، مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ ان کے دو چار ہی شعر یہاں درج کر دوں مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ابھی ہم اتنے مہذّب نہیں ہوئے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد حقّی صاحب چلے گئے اور یہ کہہ کر اُٹھے کہ جاتے ہوئے میرے پاس سے ہو کر جانا، حقّی صاحب سرکاری طور پر اور بھی

شان الحق حقی :

خود بڑے نستعلیق، خود بڑے معتبر، اچھائیاں زیادہ، برائیاں برائے نام، حالانکہ فی زمانہ ضرورت اس کی ہے کہ برائیاں زیادہ ہوں۔ اچھائیاں برائے نام ہوں۔ ان کے اتنے ثقہ ہونے کی وجہ ان کا گھریلو ماحول اور خاندانی شرافت ہوگی۔ ورنہ میں جانتا ہوں یہ بڑے باغ و بہار قسم کے آدمی ہیں۔ یاروں میں بیٹھے ہوں گے تو یہ کوئی نہ جان سکے گا کہ یہ وہی صاحب ہیں۔ جن کی خاندانی شرافت کے ڈنکے بجتے تھے۔ مطلب یہ کہ دوستوں میں بیٹھ کے اچھے خاصے معقول آدمی ہوتے ہیں۔ فقرے بازی بھی، چھیڑ چھاڑ بھی، ایک یبوست نہ ہوئی تو نہ سہی !

کچھ ہیں۔ مگر ترقی اُردو بورڈ کے سیکرٹری بھی ہیں۔ یوں دفتری طور پر شاید سبھی
ان کے ماتحت ہوں۔ مگر ان کے ساتھ کام کرنے والے 'بڑے بڑے
فاضل لوگ ہیں۔ جن میں جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر شوکت سبزواری ایسے
علامہ اور ان کے ساتھ چھوٹے موٹے کئی علامہ' جیسے سخاوت مرزا،
معین الرحمٰن، شاہد حمید وغیرہ، اس لیے حقی صاحب ہی ان کے ماتحت
ہوں تو ہوں۔ کوئی ان کے ماتحت کیوں ہوگا۔ شرافت بھی بڑی بُری بلا
ہے۔ مخدوم کو خادم بنا کے چھوڑتی ہے۔ غرض انتظامی امور حقی کے
کھاتے میں ہیں اور تحریری جوش ملیح آبادی کے کھاتے میں' ——— اور
ریڑھ کی ہڈی ہیں ڈاکٹر شوکت سبزواری' یہ سب لوگ اُردو کی لغت
تیار کر رہے ہیں۔ جو بلاشبہ خاصے کی چیز ہوگی۔ مگر اس خاصے کی چیز
پر خاصا روپیہ صرف ہو رہا ہے۔

میں جوش صاحب کے پاس کوئی گیارہ بجے پہنچا۔ تین بجے
تک رہا۔ اٹھا اس لیے تاکہ یہ بھی کچھ کر سکیں۔ ان کی میز پر بڑا کام جمع
تھا اور یہ پلندوں کو دیکھ دیکھ کے سہمے جا رہے تھے ——— آنکھیں چرا
رہے تھے۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے، جوش صاحب نے گھر چپڑاسی کو بھیجا
تھا کہ بیگم صاحب سے کہنا۔ ہمیں پچاس ساٹھ روپے بھیج دیں۔ ایک تو

ہمارے پاس سواری کے پیسے نہیں۔ دوسرے برف کے لیے تھرموس خریدیں گے۔ اگر وہ تھرموس کے لیے روپے نہ دیں تو کرایہ وغیرہ کے لیے پانچ دس روپے لے آنا۔

میں اُٹھنے والا تھا کہ چپراسی واپس پہنچ گیا۔ "پانچ روپے دیے ہیں۔ کہتی تھیں تھرموس خود خرید دیں گی۔ جوش صاحب مہنگا خرید کے لے آئیں گے۔"

اس پر جوش صاحب نے کہا۔ "ہماری بیگم ہمیں احمق سمجھتی ہیں۔"

وعدے کے مطابق، حقّی صاحب کے پاس پہنچا۔ اس طرح ملے جیسے ابھی ملاقات ہوئی ہو۔ مارے تکلّف کے اُٹھے۔ مسکرا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خیر خیریت پوچھی۔ لطف آگیا۔ جیسے اِس کمرے میں اور اُس کمرے میں کوئی فرق واقع ہو گیا ہو۔ جیسے اخلاقی ضابطے کی تکرار ضروری ہو۔ خوشئے دلداری ہو تو ایسی! —— پوچھا "آپ نے ہمارا دفتر دیکھا ہے؟"

میں نے کہا۔ "اس دفتر کے چند آدمیوں کو تو دیکھا ہے اور کچھ نہیں دیکھا۔"

"آئیے میرے ساتھ!"

"یہ سخاوت مرزا ہیں؟"

"جی ہاں تعارف ہے۔"

سخاوت مرزا نے اس موقع کو غنیمت جان کر سوال کر ڈالا ۔

"صاحب میرا وہ مثنوی پر مضمون ابھی تک نہیں چھپا۔"؟

"چھپ جائے گا - ابھی مثنوی نمبر ہی نہیں چھپا۔"

آئیے - دیکھیے - یہ ہمارا کیٹلاگ روم ہے - اس میں وہ تمام الفاظ لکھ رکھے ہیں - جو اب تک ملے - جب جس حرف کی باری آئے گی اس وقت ان حروف اور ان کے علاوہ دوسرے حروف کے بارے میں چھان بین کر لی جائے گی۔"

"آپ الفاظ کس طرح جمع کرتے ہیں ؟"

"ایک تو ہمارے پاس وہ تمام الفاظ ہیں - جو مختلف لُغتوں میں اب تک آچکے ہیں - ان کے علاوہ اور الفاظ کی بھی تلاش رہی ہے - اس کے لیے ہم یوں کرتے ہیں کہ ہماری جتنی کلاسیکل کتابیں ہیں - ان میں سے الفاظ تلاش کرتے ہیں - اچھی سوجھ بوجھ رکھنے والوں کو ہم کتابیں بھیجتے ہیں اور ان سے درخواست کرتے ہیں کہ ان میں جتنے الفاظ نئے معلوم ہوں - وہ ہمیں نوٹ کر کے بھیج دیں - اگر وہ الفاظ ہمارے پاس پہلے سے نہ ہوں تو انھیں اپنے ذخیرۂ الفاظ میں جمع کر لیتے ہیں۔"

میں نے کہا - "بعض چیزوں کے نام اور بعض کیفیتوں کے اظہار کے لیے الفاظ نہیں ملتے - اس لیے اس اہم کام کو پوری ہمہ جوئی اور پوری

ہمہ سوئی کے ساتھ کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ کسی قسم کی تشنگی باقی نہ رہے۔
"ابھی ایسی تشنگیوں کے بارے میں ہم کچھ نہیں کر رہے۔ اس لیے کہ یہ کام ہمارے دائرۂ اختیار میں نہیں آتا۔ جو الفاظ موجود ہیں۔ ہم تو صرف انہی کے معنی اور محلِ استعمال بتائیں گے۔ نئے الفاظ بنانا ہمارا کام نہیں۔"

"بے شک آپ کا کام نہیں۔ مگر لغت کے آخر میں ایک حصّہ ایسا شامل کر دیجیے گا۔ جس سے مجھ ایسے غبی کا کام چل جائے۔"

"ابھی اتنا ہی کام کر لینے دیجیے جتنا کہ فرائض میں ہے۔ نفلیں اور سنتیں بعد میں پڑھ لی جائیں گی۔"

"اب تک لغت کے بارے میں جتنا کچھ آپ نے چھاپا ہے، وہ دکھائیے۔"

"ابھی تک تو حرف الف میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

"الف کا حرف ہو جائے تو سمجھ لیجیے۔ آدھی لغت ہو گئی۔"

"جی ہاں یہ تو ہے۔"

اس کے بعد کسی صاحب کو بلایا اور اس سے کہا "اب تک ہم نے جتنی کتابیں چھاپی ہیں۔ ان کا ایک ایک نسخہ لائیے اور جتنی لغت چھپی ہے اس کی تمام قسطیں لائیں۔"

جو کچھ اور جتنی چیزیں سامنے تھیں، وہ مہیا کر دی گئیں۔ باقی کے لیے وعدہ ہوا کہ براہِ راست لاہور بھجوا دی جائیں گی۔

جو کچھ مجھے ملا۔ ان میں مولانا محمد حسین آزاد کی اُردو ریڈریں بھی تھیں، جن کی مجھے تلاش تھی اور ملتی نہ تھیں۔ میں اس اکیلے کام سے خوش ہو گیا —— مگر اتنا اور عرض کیا۔ "اب مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی بھی ریڈریں چھاپ ڈالیں۔ یہ بھی خدمت ہو گی۔"

کوئی چار بجے کے قریب، میں انجمن ترقی اُردو بورڈ سے نکلنے میں کامیاب ہوا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری سے نہ ملا۔ جو بلا شبہ زیادتی کی ذیل میں آتا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں اُوپر والی منزل میں تھے۔ جب نیچے والی منزل میں گیارہ سے چار بج گئے ہوں تو "عالمِ بالا" میں نہ جانے کے بجتے۔

پانچ بجے ایک صاحبہ سے ملنا طے تھا۔ ان سے کئی گھنٹے باتیں ہوئیں۔ وہ باتیں میری یادداشتوں میں بڑی اُجلی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر میری مجبوری یہ ہے کہ ان کا ذکر دانستہ حذف کر رہا ہوں۔ یوں میں نے اپنی کسی کمزوری کی بنا پر نہیں کیا، بلکہ یہ صورت اس لیے اختیار کرنی پڑی کہ معقولیت کا تقاضہ یہی ہے۔ کون بکھیڑے میں پڑے۔

ژاں پال سارتر کہتے ہیں —— "اگر ہم نے لکھنے کا پیشہ اختیار کر لیا ہے

تو ہم میں سے ہر شخص ادب کے سامنے جواب دہ ہے!" ــــ میرا خیال ہے ادب کے سامنے جواب دہ ہونا نسبتاً آسان ہے۔ مگر زمانے کے سامنے جواب دہ ہونا اُتنا آسان نہیں۔

رات ساڑھے آٹھ بجے کے قریب "انجمن ادبی رسائل" کی میٹنگ تھی۔ کھانا بھی تھا۔ چونکہ میں اس انجمن کا ایک چھوٹا موٹا عہدے دار ہوں۔ اس لیے میری آمد پر، انجمن کا ہنگامی اجلاس ہوا۔ اپنے مسائل پر باتیں ہوئیں۔ سنجیدہ مسائل کے ساتھ ساتھ لطیفے بھی چلتے رہے۔ ایک خوشگوار فضا تھی۔ جس میں مولانا رازق الخیری، شاہد احمد دہلوی، ضیاءالدین برنی، ماہرالقادری، صہبا لکھنوی، منظر خیری اور ڈاکٹر یونس بیٹھے چہک رہے تھے۔ مگر پریشان بھی تھے۔ پریشان اپنے مسائل سے تھے۔ چہکنا دوستانہ ماحول کا عطیہ تھا۔

کھانے پکانے کا انتظام ہمیشہ سے ڈاکٹر یونس نے اپنے ذمّہ لے رکھا ہے۔ انجمن کی طرف سے جب بھی کراچی میں کوئی دعوت ہوئی۔ اُس میں ڈاکٹر صاحب کے ذوق کی داد دینی پڑی۔ اس بار بھی انھوں نے بڑے سلیقے کی چیزیں مہیا کیں۔ لطف آگیا۔ اگر ہماری مجلسِ عاملہ میں ضیاءالدین برنی اور ڈاکٹر یونس نہ ہوں تو یہ انجمن ایسے "بقراطوں" پر مشتمل ہوتی جنھیں رونے پیٹنے کے سوا کوئی کام نہ ہوتا۔

رات کے دس بجے کے قریب فضل احمد کریم فضلی کا ٹیلیفون آیا۔ اُس وقت فضلی صاحب کے ہاں مشاعرہ برپا تھا۔ انھوں نے ماہرالقادری کو اور مجھے بلایا۔ میں تو کئی دنوں کا تھکا ماندہ تھا۔ اس لیے میں تو نہ گیا۔ ماہر صاحب پہنچے۔ وہاں کیا ہوا۔ مجھے اس کا علم نہیں۔ ویسے فضلی صاحب کے ہاں باقاعدہ شعر و شاعری کی محفلیں جمتی رہتی ہیں۔ دادِ سخن دی اور لی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کا دم بھی غنیمت ہے۔ جو اس زمانے میں شعر و شاعری کی باتیں کرتے ہوں۔ ورنہ زمانہ تو ریسوں اور نائٹ کلبوں کا ہے۔

۱۲ رجولائی ۱۹۶۳ء کو جو میری واپسی کا دن تھا۔ اُس دن میں نے اپنا کوئی پروگرام نہ رکھا۔ سوائے اس کے کہ جو میں چاہوں وہ کروں باقی دن تو احباب کے رحم و کرم پر منحصر تھے۔ صبح نکلتا تھا۔ رات لوٹتا تھا نہ وہ دن میرے تھے۔ نہ وہ راتیں میری تھیں۔ آج اس سفر کا پہلا دن تھا۔ کہ میں ذہنی آزادی محسوس کر رہا تھا۔ پہلے تو میں اُس دن دس بجے بستر سے اُٹھا۔ ایک خط لکھنا تھا۔ وہ لکھا۔ پھر اُن دوستوں کو ٹیلیفون کیے۔ جن سے ملاقات کا اشتیاق بھی تھا اور فرض بھی، مگر وقت کے سکڑ جانے کی بنا پر نہیں مل سکا تھا۔ اُن میں ایک لفٹنٹ انور تھے۔ جن سے کبھی بڑی یاری تھی۔ اس کے بعد تعلقات دوستی تک آئے۔ اب رسمی سی سلام دعا باقی ہے۔ چونکہ میں دوستانہ قدروں پر ایمان رکھتا ہوں۔ اس لیے وقتی کھچاوٹ کے

باوجود دیا یوسی میرے نزدیک بھی نہیں پھٹکتی۔

جمیل جالبی کی بھی موہنی صورت دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ مگر بات وہی وقت کی تھی۔ کیا کرتا۔ ان سے بھی ٹیلیفون ہی پر خیر خیریت پوچھ لی۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ دفتر آئیے۔ مگر میں جا نہ سکا۔ ویسے بھی اللہ ایسے دفتروں سے واسطہ کم ہی ڈالے۔ بلا وجہ خون خشک ہوتا ہے ـــــ خیر سے آپ انکم ٹیکس افیسر ہیں نا!

لاہور سے چلتے وقت مشفق خواجہ سے بھی ملنے کا ارادہ تھا۔ اس لیے کہ میرے ایک دوست نے کہا تھا۔ خواجہ صاحب سے مل کر آنا۔ پھر ہمارے درمیان کچھ غلط فہمیاں بھی بڑھ رہی تھیں۔ اس لیے ملاقات ہو جاتی تو اچھا ہی تھا۔ یا تو غلط فہمیاں ختم ہو جائیں یا پھر وہ "صحیح فہمیاں" بن کر ہمارے کرداروں کو اور واضح کر دیتیں۔ مگر افسوس کہ سلام دعا اُسی ایک آلہ ہی کے ذریعے ممکن ہوئی۔ رُد برد کی نوبت نہ آئی۔

اس کے بعد ٹیکسی لے کر بازار پہنچا۔ بیوی کے لیے کپڑے خریدے۔ یہ میری کمزوری ہے (شاید سبھی کی ہو) کہ میں جہاں جاتا ہوں۔ بیوی کے لیے بہت کچھ خریدتا ہوں۔ تاکہ وہ مجھ سے خوش رہیں۔ مگر یہ میری بدنصیبی کہ وہ خوش نہیں ہوتیں۔ عورت کو کس طرح خوش رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے سوچنے کا مجھے ابھی تک وقت نہیں ملا۔ جس دن وقت ملا۔ اُس دن شاید انھیں، مجھ

سے کوئی شکایت بھی نہ رہے۔

خریداری سے فارغ ہو کر کلفٹن (سمندر کے کنارے) چلا گیا۔ اس لیے کہ مجھے کلفٹن پہنچ کر عجیب طرح کا سکون ملتا ہے۔ میں دنیا کے سارے دکھ اور غم بھول جاتا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں بھی معصوم ہوں اور یہ ساری دنیا بھی معصوم ہے۔ سب کچھ بھلا ہی بھلا لگتا ہے اور قدرت پر اتنا پیار آتا ہے کہ کیا کہوں!

کراچی چھوڑنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ کچھ اس کوٹھی کا بھی نقشہ کھینچوں جہاں میں رہا۔ میری مراد پیر علی محمد راشدی کی کوٹھی سے ہے۔ صاف ستھری، بہت بڑی، قیمتی سامان، قیمتی پینٹنگس، مگر وہ جوانوں کے رہنے کی جگہ نہیں۔ اس لیے کہ وہاں ایسی ایسی تصویریں آویزاں ہیں کہ بوڑھا جوان ہو اٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تصویریں بوسے بغیر در غلاتی رہتی ہیں۔ کون ان کے خاموش تکلم سے متاثر ہوتا ہے۔ کون نہیں ہوتا۔ یہ معاملہ ظرف کا ہے۔

پیر علی محمد راشدی کے ملازم غلام نبی کا حال بھی سن لیجیے۔ یہ صاحب اَن پڑھ ہیں۔ مگر بقدرِ ضرورت انگریزی بول لیتے ہیں۔ حالاتِ حاضرہ پر تو ایسا ایسا تبصرہ کرتے ہیں کہ بہت سے پڑھے لکھے بھی پانی بھریں۔ اور لیڈرانِ کرام سُنے تو وہ کچے چبھتے کہ کوئی سُنے اور یہ سنائیں ـــــ

دنیا بھول جائے۔

لیجیے یہ رام کہانی جو چند دنوں پر مشتمل تھی۔ختم ہوئی۔

میں لاہور پہنچ گیا۔

ٹیلیفون پر ژتخل سیکرٹری نے پوچھا۔" شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس سے ہو آئے "۔

"جی!"

"کیسا رہا سفر؟"

"عرض کروں گا۔"

میں نے یہ تو کہہ دیا کہ عرض کروں گا۔مگر بات وبال ہوگئی۔خیال تھا کہ ان چند دنوں کی یاترا میں جو کچھ پایا اور جو کچھ جانا ہے۔اُسے اپنی اُنگلی سے ریت کے میدانوں میں لکھ دوں گا۔

ابھی یوں سوچ ہی رہا تھا کہ سقراط سامنے آکر کھڑا ہوگیا ——
اُس نے کہا۔میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں اور وہ یہ کہ کچھ نہیں جانتا۔

ہزارہا میل کا سفر بھی، جب ختم ہوتا ہے تو وہ بھی صرف ایک قدم پہ، سفرِ حیات کی سمتیں مختلف ہوتی ہیں، مقاصد جُدا جُدا، مگر ہر شخص کی اِبتدا ایک، انتہا ایک، وہی ایک قدم!

محمد طفیل

کے اسکیچوں کے نادر مجموعے

صاحب

اس کتاب میں :-

(۱) جگر مراد آبادی
(۲) فراق گورکھپوری
(۳) سعادت حسن منٹو
(۴) احمد ندیم قاسمی
(۵) شوکت تھانوی
(۶) عابد علی عابد
(۷) احسان دانش

کا تذکرہ ہے

جناب

اس کتاب میں :-

(۱) بابائے اردو
(۲) پطرس بخاری
(۳) قاضی عبدالغفار
(۴) یگانہ چنگیزی
(۵) اختر شیرانی
(۶) مجاز لکھنوی
(۷) حمید احمد خان
(۸) ڈاکٹر محمد باقر
(۹) میرزا ادیب
(۱۰) بلونت سنگھ
(۱۱) قدرت اللہ شہاب
(۱۲) عشرت رحمانی
(۱۳) ظہیر کاشمیری
(۱۴) قیوم نظر
(۱۵) ابراہیم جلیس
(۱۶) اے حمید
(۱۷) شکیلہ اختر
(۱۸) اشفاق احمد
(۱۹) انتظار حسین
(۲۰) ناصر کاظمی
(۲۱) سیف الدین سیف
(۲۲) محمد طفیل

کا تذکرہ ہے

آپ

اس کتاب میں :-

(۱) جوش ملیح آبادی
(۲) نیاز فتحپوری
(۳) اختر اورینوی
(۴) کرشن چندر

کا تذکرہ ہے۔

اگر آپ ان شخصیتوں سے قُرب حاصل کرنا چاہتے ہیں تو مندرجہ بالا کتابوں کا مطالعہ کر لیجئے۔